اپریل سنہ ۶۱ء

نخل

سالانہ چندہ

ہندوستان و پاکستان

دس روپے

قیمت فی کاپی

ہندوستان

پچھتر پیسے

پاکستان

۱۲/

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

چالیسواں سال | فہرست مضامین اپریل ۱۹۶۱ء | شمارہ ۴

ملاحظات ..... اڈیٹر ۳
ثموی چندر کرن فارسی ..... نثار احمد فاروقی ۶
مرزا غالب کی فارسی شاعری ... محمد حسین عرشی سکر ۱۴
حافظ غلام رسول شوق ..... محمد انصار اللہ نظر ۲۰
میر باقر علی داستان گو ..... سید یوسف بخاری دہلوی ۲۳
باب الاستفسار (حضرت عائشہ کی عمر شادی کے وقت کیا تھی) ۲۹
باب المراسلہ والمناظرہ (میرزا غلام احمد صاحب اور تحریک احمدیت - ۳۵
عقل انسانی سے باہر ۴۳
منظومات :- دانش فرازی، شفا گوالیاری
روش صدیقی، شارق ایم، اے
شفقت کاظمی، الطاف شاہد ... ۴۶
مطبوعات موصولہ ۴۹

ملاحظات

فرقہ وارانہ فسادات

ایک مدعی جمہوریت ملک کی بدنصیبی اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ باوجود "نا مذہبی" حکومت ہونے کے وہ ان فسادات کو نہ روک سکے جو ہوتے ہیں دراصل مذہبی اختلاف ہی کی بنیاد پر لیکن اصطلاحاً انھیں "فرقہ وارانہ" کہا جاتا ہے۔

مذہب اور فرقہ میں بڑا فرق ہے۔ ایک کا تعلق اعتقادات دینی سے ہے اور دوسرے کا مصالح دنیوی سے۔ مذہبی فساد کی بنیاد پڑتی ہے مندر و مسجد میں اور فرقہ وارانہ فساد کی ایوان حکومت اور انتخابی میدانوں میں!

اس میں شک نہیں فساد و خونریزی خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو، نہ صرف ننگ حکومت بلکہ ننگ انسانیت ہے اور ہندوستان ابھی تک اس منزل پر نہیں پہنچا جب وہ یہ کہہ سکے کہ اس کی پیشانی دونوں حیثیتوں سے بے داغ ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ خود ہندوؤں میں بھی اتحاد نہیں لیکن ان کا اختلاف مذہبی عقاید کا اختلاف نہیں، بلکہ ذات پات، سماج اور کلچر کا اختلاف ہے جو کسی وقت دور بھی ہوسکتا ہے برخلاف اس کے ہندو مسلم اختلاف مذہبی اختلاف ہے اور اس کے دور ہونے کی صرف تین صورتیں ہیں، یا تو سب ایک ہی مذہب اختیار کرلیں یا سب لامذہب ہو جائیں یا پھر یہ کہ ان میں اس امر کا احساس پیدا ہو جائے کہ جامعۂ بشری کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ ذہنی و عملی رواداری سے ہے اور یہ اتنی بلند

بات ہے کہ اس کا احساس اس وقت تک مغرب کی ترقی یافتہ اقوام میں بھی پیدا نہیں ہوا، ایشیاء کی جاہل اقوام کا کیا ذکر۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں امن وسکون کا مسئلہ عوام سے نہیں، بلکہ حکومت سے متعلق ہوکر رہ جاتا ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔

جمہوریت بڑی نازک چیز ہے، اگر کسی ملک کی تمام آبادی ایک ہی سیاسی نظریہ کی قایل ہو تو جمہوریت کا تصور ہی سرے سے غلط ہوجاتا ہے اور اگر وہ مختلف نظریہ رکھنے والی مختلف جماعتوں میں بٹی ہوئی ہے تو پھر ان کو مطمئن رکھنے کا سوال سامنے آتا ہے، سو یہ سوال ان ملکوں میں تو زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جہاں مذہبی اختلاف بالکل ذاتی وانفرادی چیز ہے، لیکن ایسے ملکوں میں جہاں مذہب، سیاست وسماج سب ایک ہی چیز سمجھے جاتے ہوں، وہاں امن وسکون کے بقا کا سوال بہت پیچیدہ ہوجاتا ہے — ہندوستان بدقسمتی سے ایسا ہی ملک ہے اور اسی لئے یہاں کی حکومت اب تک ہندو مسلم فسادات کا سدباب نہیں کرسکی۔

ہم اس وقت فیروزآباد، جبل پور، مرادآباد یا دوسرے مقامات کے فسادات کی تفصیل میں جانا پسند نہیں کرتے، کیونکہ یہ بالکل بے نتیجہ سی بات ہے، لیکن اصولی طور پر یہ سوچنے کا حق ضرور رکھتے ہیں کہ کیا ہندوستان میں ہندو مسلم فساد کا سلسلہ کبھی بند ہوسکتا ہے یا نہیں اور اگر اس کا امکان ہے تو اس کی کیا صورت ہے۔

جس حد تک حکومت کا تعلق ہے ہم اس سے صرف ایک اصولی بات یہی کہہ سکتے ہیں کہ "دنیا کی کوئی جمہوریت اسوقت تک صحیح معنی میں جمہوریت کی مدعی نہیں ہوسکتی جب تک وہ اقلیت کو پوری طرح مطمئن نہ کرسکے"۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اقلیت کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس کو تمام پابندیوں سے مستثنیٰ کردیا جائے، کیونکہ حکومت لاکھ کوشش کرے لیکن وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی اگر اسے اقلیت کا تعاون حاصل نہ ہو اور اس تعاون کے معنی یہی ہیں کہ وہ خود اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہ کرے جو فتنہ وفساد کا سبب بن سکتی ہے۔ اب آیئے اس سلسلہ میں ذرا تفصیل کے ساتھ حکومت و اقلیت دونوں کے فرایض کا جایزہ لیں۔

حکومت جماعتوں کے ذہنی ومذہبی اختلاف کو تو دور نہیں کرسکتی۔ ہندو کبھی اس کو پسند نہ کرے گا کہ بھگوان کو خدا کے نام سے پکارا جائے اور نہ مسلمان کو کبھی یہ گوارا ہوگا کہ وہ خدا اور بھگوان کو ایک ہی چیز سمجھے، ایک عامی مسلمان ہمیشہ صدائے ناقوس سن کر چیں بہ جبیں ہوجائے گا اور ہندو اذان کی آواز سن کر کبھی خوش نہ ہوگا۔ لیکن حکومت یہ ضرور کرسکتی ہے کہ اگر اس سلسلہ میں اندیشہ نزاع کا ہو تو پہلے ہی احتیاطی تدابیر سے کام لیکر فساد وخونریزی کا سدباب کردے اور اگر بعض ناگزیر حالات میں وہ ایسا نہ کرسکے تو پھر وہ عدل وانصاف میں عجلت سے کام لے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری حکومت دوسرے معاملات کی طرح اس کو بھی "Bureaucracy" کے سپرد کردیتی ہے اور آج کی بات اس کل پر ٹالدیجاتی ہے جو کبھی آتا ہی نہیں یا اگر آتا بھی ہے تو مہینوں کی تاخیر سے۔

اس میں شک نہیں عدلیہ اور آمرانہ فرایض دونوں بڑی حد تک ایک دوسرے سے وابستہ ہیں لیکن بعض مسایل ایسے ہوتے ہیں جنھیں عدلیہ کی وساطت کے بغیر، محض آمرانہ اقدام ہی سے طے کرنا ضروری ہوجاتا ہے، اور فرقہ وارانہ اختلافات بالکل اسی قسم کے مسایل ہیں۔

مثلاً جبل پور کے فساد ہی کو لیجئے کہ جس وقت اس کا آغاز ہوا تھا تو صوبہ اور مرکز کی حکومت کو کیا کرنا چاہئے تھا۔ بھوپال سے کانجو کو اور دہلی سے پنڈت نہرو کو فوراً وہاں پہونچ جانا چاہئے تھا اور خود اس کی تحقیق کرنا چاہئے تھی کہ اختلاف کے بانی کون ہیں اور اس اختلاف کو خونریزی کی حد تک پہونچانے میں مقامی حکام کا تو ہاتھ نہیں اور اسی وقت عزل ونصب اور گیرودار

شروع کر دینا چاہیئے تھی - لیکن ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ جب وہاں سب کچھ ہو چکا تو پھر سوچا گیا کہ اس واقعہ پر کم از کم اظہار تاسف دملال تو کر ہی دینا چاہیئے اور پھر اس کے بعد وہی تحقیقاتی کمیشن والا نہ ہونے والا قصہ شروع کر دیا گیا، جس کے آغاز کا تو علم ہو جاتا ہے لیکن انجام کا کسی کو کچھ پتہ نہیں چلتا - کیا یہ ممکن نہیں کہ اس قسم کے فوری اقدامات کے لئے آرڈیننس جاری کر دیا جائے اور یہ بات قانون کے حدود میں آجائے -

یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ بعض صورتوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے لئے پہلے سے سازش کی جاتی ہے اور محض حکام کے تغافل یا بیجا چشم پوشی سے وہ کامیاب ہو جاتی ہے، ان حالات میں حکام کے خلاف فوری تادیبی کارروائی کی ضرورت ہے اگر فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں صرف مقامی حکام کو تنہا ذمہ دار قرار دے کر آئینی تارک کا قانون بنا لیا جائے تو فساد بڑی حد تک دور ہو سکتا ہے -

کہا جاتا ہے کہ حالیہ فسادات جن سنگھی جماعت کی سازش کا نتیجہ ہیں جس سے ان کا مقصود مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات ڈالنا ہے کہ کانگرس حکومت ان کی حفاظت کی اہل نہیں اور آیندہ انتخاب کے وقت اس کے حق میں رائے دینا مناسب نہ ہوگا - اگر یہ صحیح ہے تو موجودہ کانگرس حکومت کو اور زیادہ باخبر رہنے اور مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کی ضرورت تھی - لیکن افسوس ہے کہ مدھ پردیش کی حکومت نے اس باب میں کوئی سبقت کی اور نہ مرکزی حکومت نے کسی خاص توجہ سے کام لیا -

یہاں تک تو محض حکومت کے فرایض کا ذکر تھا، لیکن یہ بالکل یک طرفہ بات ہوگی اگر اسی کے ساتھ ہم اقلیت کے فرایض کا ذکر نہ کریں - جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں، اچھی سی اچھی حکومت بھی قیام امن کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتی اگر اقلیت اس کے ساتھ تعاون نہ کرے - پھر اقلیت کے تعاون کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ خود اپنے ذہن میں تبدیلی پیدا کرے اور وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو اکثریت کے لئے باعثِ اشتعال ہو -

اکثر و بیشتر جھگڑا اس بات پر ہوتا ہے کہ اذان و نماز کے وقت مسجد کے سامنے سے کوئی جلوس گاتا بجاتا نکلے - لیکن اس کا تعلق ہندوؤں کی رواداری سے ہے اور اگر وہ اس کے لئے آمادہ نہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان اس پر برافروختہ ہو جائیں، اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے اذان و نماز کو ملتوی نہیں کر سکتے تو بھی ان کو سمجھنا چاہیئے کہ مسلمانوں نے تو جنگ کے ہنگاموں میں بھی نماز ادا کی ہے اور اگر انھیں کامل یکسوئی حاصل ہو تو جلوس کا شور و غوغا کیا، صور اسرافیل بھی ان کی عبادت میں حایل نہیں ہو سکتا - اگر ہم مان لیں کہ ہندو قصداً یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ذہنی تکلیف پہونچائیں اور ان میں اشتعال پیدا کریں، تو اس کا معقول جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان ان کو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیں اور اپنی متانت و سنجیدگی و بلندی نفس کا ثبوت دے کر خود ان کو اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو جانے دیں -

اس میں شک نہیں کبھی کبھی ایسی باتیں بھی فساد کا باعث ہو جاتی ہیں جن کا تعلق مذہب و مراسم مذہب سے نہیں بلکہ انفرادی بدتمیزی سے ہوتا ہے، جیسا کہ حال ہی میں جبلپور میں دیکھا گیا سو اس میں البتہ اقلیت ایک حد تک مجبور ہے، لیکن یہ المیہ کوئی نئی بات نہیں، ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اس قسم کے جماعتی فسادات ہوتے رہتے ہیں اور دنیا جب تک قایم ہے برابر ہوتے رہیں گے - تاہم اقلیت کی کوشش ہمیشہ یہی ہونا چاہیئے کہ اس کی طرف سے کوئی چنگاری نہ پیدا ہو اور اگر اکثریت پھر بھی بدتمیزی سے کام لے تو بے شک اسے پوری استقامت کے ساتھ بے خوف ہو کر حکومت سے اپنے حقوق کی حفاظت کا مطالبہ و محاسبہ کرنا چاہیئے -

ہمارے ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ یہاں کی سیاسی پارٹیوں کا اختلاف وطن پرستی سے اتنا تعلق نہیں رکھتا جتنا حصول جاہ و اقتدار سے اور یہ کمزوری خود کانگرس پارٹی کے بعض افراد میں بھی پائی جاتی ہے - اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدمت ملک و وطن کا وہ بلند جذبہ جو گاندھی جی نے پیدا کیا تھا قریب قریب مٹ گیا ہے اور اس کی اخلاقی حیثیت بہت گر گئی ہے، تاہم کانگرس پارٹی بساغنیمت ہے، اس کے بعض افراد واقعی ملک کے خادم ہیں اور جمہوریت کی کچھ روشنی تو ان میں پائی جاتی ہے خواہ وہ کتنی ہی ہلکی کیوں نہ ہو - دوسری جماعتوں میں تو اس کا احساس تک نہیں اور وہاں اندر باہر سب اندھیرا ہی اندھیرا ہے -

مثنوی چندر کرن فارسی

(نثار احمد فاروقی)

کتب خانہ سالار جنگ میوزیم (حیدر آباد) میں مثنوی چندر کرن فارسی کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ متن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف ناقد ہے[1]۔ کتاب میں اس کے نام کی صراحت کہیں نہیں ملتی یہ نسخہ مصور بھی ہے۔ اس کی ابتدا حمد، مناجات اور نعت کے اشعار سے ہوتی ہے:-

بنام ملہم سرِّ نہانی — صفیر آموز مرغِ بوستانی
قدیرے چہرہ آرائے رخِ گل — حکیمے تاب بخشِ جعدِ سنبل
بدیعے کو زعالم بے نیاز است — زعشق او ہمہ عالم بناز است...
بہ گل حسن و بہ بلبل نالہ او داد — فلک را ماہ و مہ را ہالہ او داد
صدف را دُر دہد، دُر را دہد آب — فلک را خورد دہد، خور را دہد تاب...
(۲ ب) فلک را زو کلاہِ مہر بر سر — زمیں را زو قبائے سبزہ دربر
بیاد او بنفشہ در رکوع است — بفکرش شاخ سنبل در خضوع است..

حمد کے بعد ورق ۴ - الف سے مناجات شروع ہوتی ہے:-

خدایا خاطرم را شاد کن شاد — دل ویرانہ ام را ساز آباد
مئے صاف محبت در دلم ریز — نمے از فیض در آب و گلم ریز
دلم سرچشمۂ اسرار فرما — سرم خاکِ رہِ ابرار فرما...

اس کے بعد نعت سید المرسلین کا آغاز (ورق ۶ - الف) ہوتا ہے جس کا عنوان ہے:-

"در نثار گوہر نعت بروضۂ منورہ حضرت خاتم النبیین علیہ من التحیات اکملہا"

اور چند اشعار یہ ہیں:-

بیا خامہ کنوں از سر بکن پا — بپائے فرق رہ را بہ پیمائے (کذا)
ادب را ساز اکنوں پیشۂ خویش — جگر بشگاف و دل را ریش کن ریش...
شہے زینت فزائے ہفت خرگاہ — شہے پردہ کشائے "لی مع اللہ"
گزیدہ کوکب برجِ نبوت، — منور گوہر درج فتوت...
(۶ ب) کریما، کارساز ا بے نیازا — بوقت بے کسی بے کس نوازا

---

[1] نسخۂ قلمی ورق ۸ ب (ہندستانی لوک قصوں سے متعلق جو مثنویاں فارسی اور اردو میں لکھی گئیں اُن میں سے بعض اہم مثنویوں کی تفصیل آئندہ مضامین میں پیش کی جائے گی - یہ اس سلسلہ کا پہلا مضمون ہے)

(۷-الف) شفیع مجرمانِ بے پر و بال بوصفت ناطقہ ہم گنگ و ہم لال...

اس کے بعد (ورق ۸-ب) کا یہ عنوان ہے :- "صفت معراج آں درۃ التاج بحر رسالت و کوکب دری فلک جلالت علیہ السلام"
اسی کے ضمن میں دعائیہ اشعار میں مصنف نے اپنا تخلص بھی لکھ دیا ہے :-

شب معراج آں ماہ فلک بخت کشید از خوابگہ سوئے فلک رخت...

(۸-ب "تضرع و زاری در حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم) :-

شفیعا، بادشاہا، تاجدارا جوادا کارسازا کامگارا،
خدارا سوئے ناقد یک نگہ آرا کہ او گمراہ شد او را برہ آر
کریما حال ناقد بس تباہ است دلش تاریک و روئے او سیاہ است
چگویم او بجرم قلب عاصی، غریق فی الخطایا والمعاصی

یہاں سے ناقد نے عربی میں طبع آزمائی شروع کر دی ہے تو اکٹھے ۲۲ شعر لکھ کر دم لیا ہے۔ نمونہ عربی کا بھی ملاحظہ فرمالیجئے :-

ترکت الامر و اُحبرتُ المناہی مضی الایام عمری فی الملاہی
صرفت العمر فی غیّ النصاب ومالی عذرۃ یوم الحساب
شبابی انقضی فی الغی جہلاً فمھلا یا رسول اللہ مھلاً
فعلت مامن المعاصی ما بدالی (کذا) فمالی لا ابالی من وبالی....
(۱۰-الف) فکیف یکون لا اُدری مآلی ولی ذنبٌ کثیرٌ فی اللیالی...
شفیع الحشر لی ذنبٌ کثیرٌ فادرکنی و انت بنا بصیرٌ

اس کے بعد (ورق ۱۰-ب) "ذکر سبب تالیف ایں مجموعہ ناز و نیاز و گلدستہ سوز و گداز" بیان کرتے ہیں یہ (ورق ۱۳-الف) تک چلا گیا ہے :-

شبے چوں طرۂ خوبانِ سادہ دلِ راحت بروے دل کشادہ...
بذکر عشق قیس و حسنِ لیلیٰ، یکے می داد خاطر را تسلی

یعنی احباب جمع تھے، حسن و عشق کا تذکرہ آگیا، کوئی لیلیٰ مجنوں کی بات کرتا تھا، کسی نے وامق و عذرا کا نام لیا، کوئی نل دمن کا ذکر کرنے لگا:-

یکے می گفت نل در عشق بازی ربود از عاشقانِ دہر بازی...
(۱۱-ب) یکے گفتا کہ عشق از ہند برخواست ہوائے ہند آمد عشق را راست

کسی دوست نے ان سے بھی کہا کہ تمھیں نظم پر قدرت حاصل ہے کسی ہندی قصے کو فارسی میں نظم کرو :-

بمن گفت آشنائے غم رسیدہ جفا ہا از پری رویے کشیدہ...
(۱۲-الف) ترا ایزد زبانے داد گویا، رسانده صیتِ فضلت تا ثریا...
کنی ایں قصہ گر در فرس منظوم رسد صیتِ کمالت تا رے و روم

اتنی تمہید کے بعد (ورق ۱۴-ب) سے اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی راجا چترکٹ شکار کے لئے نکلتا ہے اور راستے میں ایک باتونی "ہنس" خرید لیتا ہے۔ عنوان یہ ہے :- "آغاز داستان جنوں خیز و بیروں رفتن راجہ چترکٹ برسم شکار و بسوئے میداں و بیشہ و خریدن ہنس سخن گزار ارصیاد فطانت پیشہ"

سخن پرداز ایں شیریں حکایت چنیں گفتہ شکر ریز روایت
کہ بودہ در زمین ہند شاہے چو ترک آسماں صاحب کلاہے

لہ غالباً واخرت ہوگا۔ (نیاز)

(۱۶-الف) بسوئے صید عزم تیز می کرد — بصحرا اسپ را مہمیز می کرد...
برآمد برسمند برق انداز — نشانیدہ بدست نازنیں باز...

(۱۶-ب) قضا را آہوئے برشد نمایاں — شدہ راجہ بصید او شتاباں
برآں آہو کشادہ تیرے از شصت — نبودہ چوں اجل آہو بروں جست
خطا کرد از قضا تیر خطائی — خطائے نیست در تیر قضائی
ازاں آہو چو خالی ماند فتراک — شدہ رائے جہاں پر و غضب ناک
پئے آں آہوئے رم کردہ می گشت — بیاباں در بیاں دشت در دشت...

یہ ہرن کا تعاقب کر رہا تھا کہ راستے میں ایک صیاد نظر آیا جس کے دام میں ایک خوبصورت ہنس گرفتار ہو گیا تھا۔ بادشاہ کو دیکھ کر ہنس نے فریاد کی کہ تمھارے عدل کا شہرہ "قاف سے قاف تک" ہے میری بھی داد خواہی کیجئے۔ راجہ نے گھوڑے کو روکا اپنی کمر سے ایک موتی نکالا جس کی بہا "ہفت کشور" کے برابر تھی اور چڑیمار کو دے کر ہنس کو آزاد کرا دیا:-

(۱۷-الف) بصیادے نگاہ او برافتاد، — کہ بہر صید دام و دانہ بنہاد...
فتادہ از قضا ہنسے بدامش — سبک آنرا گرفت و کرد رامش...
نگاہ ہنس چوں بر رائے افتاد — بزودی از قفس برداشت فریاد
کہ اے رائے زمیں خورشید انصاف — گرفتہ نور عدلت قاف تا قاف....

(۱۷-ب) زدادت داد خواہم اے خدا ترس — بدہ انصاف و از روز جزا ترس
...چو فریادش بگوش رائے درشد — عناں بگرفت و لختے باخبر شد....

(۱۸-ب) مرا بستاں بقیمت زیں سرہ مرد — وگرنہ من خوشم دراندوہ و درد
... پس آنگہ از کمر بکشاد گوہر — کہ بودہ قیمت او ہفت کشور

(۱۹-ب) نہاد از مہربانی پیش صیاد — کہ ایں را گیر و او را ساز آزاد...
... گرفت انگاہ بند مرغ از پائے — نہاد آں مرغ زیرک را بر رائے
مخاطب شد بہ مرغ آں رائے والا — شدی آزاد، کن آہنگ بالا...

جب بادشاہ نے ہنس سے کہا کہ جاؤ اب تم آزاد ہو، تو وہ کہنے لگا، اب تو میں آپ کا بندہ بے دام ہوں۔ آپ کی رفاقت میں رہوں گا۔ آپ نے صیاد کی قید سے مجھے چھڑا کر اپنے "دام مہربانی" کا صید بنا لیا ہے۔ اب میں تمام عمر آپ کے ساتھ رہوں گا:-

چو گفت ایں حرف را رائے نکو کار — زمیں بوسید مرغ نغز گفتار
کہ اے جانم فدائے دست جودت — بود پیشانیم وقف سجودت
مرا گرچہ رہا از قید کردی — بدام مہربانی صید کردی
(۲۰-الف) ... جدائی از درت ہرگز نجویم — طریق بے وفائی را نپویم

یہ ہنس بادشاہ سے مزیدار باتیں کرتا اور اس کا دل لبھاتا تھا، کبھی پرانے بادشاہوں کے قصے کہانیاں سناتا، کبھی حسینوں کی بیان کرتا۔ اس سے راجہ دل و جان سے محبت کرنے لگا اور یہ دیکھ کر مہارانی رشک سے جلنے لگی:-

ہمیشہ مرغ از حرف دل آویز — بگوش رائے می بودے گہر ریز
کہن افسانہ ہائے پادشاہاں — حکایت ہائے نغز خوش نگاہاں

(۲۰-ب) ... بہر دم عزت ادبیش می کرد مہیں با نوزقدر دش رشک می خورد

ایک دن ایسا ہوا کہ رانی نزاکت سے کچھ سرگراں ہو رہی تھی، ہنس، کو ہنسی آگئی۔ رانی ویسے ہی جل رہی تھی اس نے ہنسنے کا سبب پوچھا تو اسے رانی چندر کرن کے بے پناہ حسن و جمال کی خبر سنا کر اور بھی سلگا دیا:۔

(۲۱-الف "بے دماغ شدن رانی از راجہ در رشک کردن بر مصاحبت مرغ خوش گو دخندیدن مرغ و استفسار کردن رانی سبب خندہ و بیان کردن آں حسن رانی چندر کرن)

(۲۱-ب) شبے رانی بعنوانے کہ دانی شدہ چوں نازکاں در سرگرانی...

(۲۲-الف) چو دیدہ ہنس زاں ناز و کرشمہ وزاں خونابۂ دل چشمہ چشمہ
بخندہ لب کشود و در عجب شد مہیں رانی ز ضحکش در غضب شد
شدہ در خشم و گفت اے مرغ بدفال چرا خندہ زدی تو اندریں حال...
زباں بکشاد مرغ تیز فکرت بگفت، از آسماں باشی بعشرت...

(۲۲-ب) ہمی خندم چو گل از تازہ روئی ازاں نام من آمد "ہنس" گوئی
شراب خندہ ام در جام کردند ہمانا ہنس زانم نام کردند

اور پھر یہ خبر سنائی:۔

... کہ در اقصائے مغرب ہست جائے شہنشاہے بر اں فرماں روائے (۲۳-ب)

(لب کشادن مرغ سخن پیرا از حسن رانی چندر کرن و گرفتار شدن راجہ از استماع کیفیت حسن آں پری پیکر بہ عشق غائبانہ)

بہ پردہ دخترے دارد چہ دختر بہ چہرہ رو کش خورشید و اختر
بہ قامت غیرت سرو گلستاں بہ گیسو پیچ و تاب سنبلستاں..

(۲۴-الف) رخ آں نازنین عالم آرا، صباحت با ملاحت کرد یک جا...

یہاں سے ناقد نے رانی چندر کرن کا سراپا بیان کرنا شروع کیا ہے اور تمام خط و خال کی تعریف نام بنام کی ہے:۔

... دو پستانش ترنج نادسیدہ ز شاخ صندلیں ہر دو دمیدہ

(۲۵-ب) ... بود نافش ز بحر حسن گرداب شکم آمد بہ نرمی رشک سنجاب
... سرین او کہ آمد پشتۂ گل ز گیسوئش براں افتادہ سنبل
... بشاخ مہ ز روئے او ست پیدا ازاں نامش چندر کرن است گویا
چندر کرن است نام آں نکو روئے ہمہ رایاں و صالش را بجاں جوئے

(۲۶-ب) ... کنیز انش بسے در خوبی رو زرانی بہ بود اے رائے خوش خو
شدی در عشق رانی ایں قدر کم مرا ... بر دانشت آمد تبسم،
... اگر بینی تو در خساد چندر کرن کہ ناز چرخ چوں او مہ بصد ترن
چنیں گردی تو محو روئے آں ماہ کہ دیگر برنخیزد از تو جز آہ،

(۲۷-الف "بے تاب شدن راجہ از شنیدن حسن رانی چندر کرن")

چو کردہ رائے ایں افسانہ در گوش جدا از صبر گشت و دور از ہوش...
ہمی می گفت نادانندۂ کار کہ اے غلاں حسن و عشق خوں خوار

مرا افتاد کارے سخت مشکل، دلم را برد شوخے آہنیں دل، ...
(۲۸-ب) ...مرا فیروز گرداں از وصالش شب تارم بکن روز از جمالش ...
منم قالب چندر کرن است جانم چساں بے جاں الٰہی زندہ مانم

چندر کرن کے حسن کی تعریف ہی سن کر جو راجہ کی حالت اتنی غیر ہوئی تو رانی کو اپنی بے دماغی پر بڑا تاسف ہوا اور وہ راجہ کی دلداری کرنے لگی۔ سمجھاتی بجھاتی تھی کہ ایک پرندے کی باد ہوائی باتوں کا کیا اعتبار ہے۔ اگر چندر کرن واقعی حسین و جمیل ایسی ہی ہوتی تو سیاحان آفاق آپ کے حضور اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ لیکن ان باتوں میں سے ایک بھی راجہ پر کارگر نہ ہوئی۔ وہ ہمہ وقت چندر کرن کے خیال میں محو رہنے لگا۔

(۲۸-ب - شرمسار گشتن رانی از بے دماغی و ناخوشی خود و بہ تسکین و تشفی راجہ پرداختن)

(۲۹-الف) چو دید ایں حال آں رانیِ مغرور شدہ بے تاب گشتہ زار و رنجور...
(۲۹-ب) چہ داند مرغ حرف راز کردن نداند مرغ جز پرواز کردن...
(۳۰-الف) چندر کرن اربُدے در دلبری طاق شنیدیمی ز سیاحان آفاق

(۳۰-ب - افزودن شورش عشق و دیوانگی راجہ جنوں آشنا از نالہ و زاری رانی حور لقا و کنیزان شیریں ادا)

نشد با ہیچ کس رائے جہاں رام نشد ممکن نجات او ازاں دام...

آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں تخت و تاج چھوڑ دوں گا اور جوگی بن کر چندر کرن کی تلاش میں نکلوں گا۔

بریں عزم کہ ترک راج گویم حیا را پاک زاب دیدہ شویم
شوم جوگی رسم در شہر جاناں رسم در شہر جاناں بید خواناں

(۳۱-ب - ترک تخت و تاج کردن راجہ و لباس جوگیاں پوشیدن و رعایا را در امتناع کوشیدن)

پس آنگہ جامہ را از تن بروں کرد دل بیندگاں را جوئے خوں کرد...
شدہ در کوئے و برزن حشر برپا کہ راجہ گشت جوگی وائے صد وا

جب راجہ کے جوگی بن جانے کی خبر اس کی ماں کو ملی تو وہ بھی روتی ہوئی آئی اور اپنے بیٹے کو بہت اونچ نیچ سمجھایا لیکن راجہ نے معذرت کر لی اور ماں کی کوششیں بھی سب اکارت ہو گئیں۔ (ورق ۳۳-الف تا ۳۴ ب) - اب راجہ نے اس "مرغ شکر مقال" یعنی ہنس سے دریافت کیا کہ رانی چندر کرن کون سے شہر میں رہتی ہے اور اس کا پتہ کیا ہے؟

خطاب آغاز کردہ رائے خوش رائے ازاں مرغے کہ کرد ایں فتنہ برپائے
بگفت اے ہنس خضر راہ من شو دلیل من بسوئے آں چمن شو

ہنس نے جب راجہ کی ناطاقتی اور راج کی ابتری کا یہ حال دیکھا تو دروغ مصلحت آمیز سے کام لے کر کہنے لگا کہ میں نے تو یونہی ایک جھوٹا قصہ سنایا تھا، رانی چندر کرن محض تخیل کی پیداوار ہے، اپنی دروغ گوئی پر میں سزاوار نفریں ہوں:-

چو ہنس ایں گفتگوئے او شنیدہ بسان طائر بسمل طپیدہ...
دروغے گفتہ ام کردیم تقصیر سزایم عفو باشد خواہ زنجیر

راجہ نے کہا کہ اب ایسی باتیں بنانے سے کوئی فایدہ نہیں، تیر کمان سے نکل چکا ہے ایسی طفل تسلیوں میں آنے والا نہیں ہوں جب ہنس نے دیکھا کہ راجہ پر یہ بات بھی اثر نہیں کرتی اور وہ چندر کرن کے عشق سے دست بردار نہیں ہو سکتا، تو اس نے چندر کرن کے شہر تک رہنمائی کرنے کی ہامی بھر لی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ راستے میں اتنے نشیب و فراز ہیں، ایسی ایسی کٹھن منزلوں سے

گزر کر جانا پڑے گا۔ دریا بھی آئیں گے، جنگل اور پہاڑ بھی۔ راجہ نے راہ کی دشواریوں کا بھی مطلق خیال نہ کیا۔ اور حکومت کا کام وزیر نیک تدبیر کو سونپ کر سفر کے لئے اٹھ کھڑا ہوا (ورق ۳۸۔ الف تا ۳۹ ب) اب راجہ شہر سے جوگی بن کر نکلا۔ رعایا میں سے ۹ سو "جوانانِ رعنا" جوگیوں کا لباس پہن کر اس کی رفاقت کے لئے نکلے :۔

بہ سرہا قشقۂ صندل کشیدہ ہمہ اسباب دنیاوی بریدہ (۴۰ ب)

غرض راجہ، ہنس اور اس کے رفقا رانی چندر کرن کے شہر کی تلاش میں ایک سال تک چلتے رہے :۔

بدیں ساں چوں رہ یک سالہ رفتند بآہ وحسرت و با نالہ رفتند (۴۴۔ الف)

چلتے چلتے ایک "دریائے ذخار" آیا جسے دیکھ کر راجہ کے ہمراہی بھی حیران رہ گئے۔ کیونکہ اس کو پار کرنا اتنے رفقا کے ساتھ سخت مشکل تھا۔ مگر اس اڑے وقت میں "مرغ خوش تدبیر" نے ہمت افزائی کی :۔

بگفتا غم مخور اے رائے والا، معینت باد لطف حق تعالےٰ...
ترا اے نازنیں بر پر نشانم ازیں دریائے ہائل (کذا) وار ہانم
ترا بر پر برم تا شہر دلبر، تو خوش دل شو غم و اندوہ کم خور
بگفتا رائے اے مرغ وفا کیش زتو مرہم مرا بر سینۂ ریش،
گرفتم تو مرا بر پر نشاندی ازیں دریائے خونخوارم رہاندی
ولے درہجر ایں یاران جانی چساں خواہم نمودن زندگانی... (۴۶۔ ب)

مرحلہ یہی تھا کہ ان رفیقوں کا کیا ہو۔ آخر کار بدرجۂ مجبوری ان سب کو وہیں چھوڑا اور راجہ، ہنس پر سوار ہو کر پرواز کر گیا :۔

ببال مرغ پراں گشت پراں بپائے آرزو آں راہ براں (۴۸۔ ب)

اب راجہ اڑتے ہوئے رانی چندر کرن کے شہر میں داخل ہوئے تو دور ہی سے ہنس نے رانی چندر کرن کا محل دکھایا (۵۰ الف)

یہاں ناقد نے محل کی نہروں اور باغ کی تعریف میں روانی طبع کے جوہر دکھائے :۔

چو گشتہ رائے سرگرم نظارہ شعاعے دید رخشاں در کنارہ
بگفت اے ہنس می بینم شعاعے چو چشم روسیاں بر ارتفاعے
بگفتا مرغ اے رائے فلک جاہ تو خوشدل شو کہ آمد قصر آں ماہ...

اب ہنس نے راجہ (یعنی جوگی) کو ایک گوشے میں بٹھا دیا اور خود رانی سے ملاقات کرنے چلا۔ رانی اس وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنسی دل لگی اور کھیل میں مصروف تھی :۔

نشانندہ رائے را در کوشک خوش شدہ پراں بسوئے آں پری وش
... نمودہ مرغ زاں گلزار پرواز رسیدہ پیش آں گلدستۂ ناز...
بگفتند اینک اینک مرغ خوش لحن فرود آمد ز اقبالت دریں صحن
ہمہ از جا شدند و پیش رفتند زشادی پیش او بے خویش رفتند..

اب رانی نے ہنس کو پہچان لیا اور بڑی گرم جوشی سے ملاقات کی، کہنے لگی :۔

ترا من یاد می کردم شب و روز ز دوری تو بودیم در بے سوز (کذا)
میان ہمدماں ذکر تو می ماند مرا در روز و شب فکر تو می ماند... (۵۴۔ الف)

اب ہنس نے اپنی بیتی سنائی اور بتایا کہ میں آج کل اُجین کے راجہ کا رفیق ہوں، شہر اجین کی بہت تعریف و توصیف کی کہ

وہال :- ہمہ آثار دولت ہست موجود ... مگر نقش مرادت ہست مفقود ... (۵۵ - الف)

اور کہا کہ میں نے جب سے تمھارے حسن کا عالم دیکھا تھا اسی فکر میں غلطاں رہتا تھا کہ خدا نے کوئی مخلوق بھی بغیر جوڑے کے پیدا نہیں کی۔ تمھارے لیے ایسا ہی کوئی حسین و جمیل جوان و خوبرو شہزادہ تلاش کروں۔ اسی تلاش میں ہفت کشور کی سیر کی۔ دہلی اور پنجاب میں بھی رہا، متھرا، بنارس، قندھار، کابل، فرغانہ اور کشمیر بھی سارا دیکھ ڈالا۔

بگفتا ہنس اے شاہ نکویاں ... سرد سرمیل خیل جعد مویاں ...
ازاں روزے کہ من روئے تو دیدم ... گلے از گلشن حسنِ تو چیدم ...
دل دیوانہ ام با خویش می گفت ... کہ مخلوقے نشد مخلوق بے جفت ...
بسے در دہلی و پنجاب ماندم ... ازاں جا جانب قندھار راندم ... (۵۸ - ب)
زمانے در بنارس داشتم رخت ... کہ آں جا رو نماید کوکب بخت
بہ متھرا ماہ ہا کردم اقامت ... کہ بینم چوں تو ماہ سرو قامت ...
بسوئے کابل و فرغانہ رفتم ... وہ کشمیر ازاں جا بر گرفتم ...
جہانے را بگردیدم ہوس را ... ندیدم مثل و مانی ہیچ کس را ...

اب اس نے شہر اجین کی صفت بیان کرنا شروع کی۔ اس کے بازاروں کی تعریف کے ضمن میں "تعریف حلوا فروش" (۶۹ الف)

خوشا حلوای شیریں تکلم ... کہ قند و قند بشکست از تبسم ...
کدام است آں کہ خیزد در ترا غم ... نبات کالپی باشد متاعم
سپہر سادہ پیشم خوانچہ بگشاد ... قمر را داغ دل از قندم افتاد
دگر گوید کہ اے غافل ز تدبیر ... بیا از من تو قند لکھنؤ گیر ...
ز فیض تیزی حلوائے سوہاں ... ہمہ رنج نہانی کردہ سوہاں ...

پھر "تعریف دکان بزاز" (۶۰-ب) اس کے ضمن میں اس دور کے لباسوں اور کپڑوں کی اقسام کا علم ہو جاتا ہے مثلاً:-

نشستہ بر دکاں بزاز زیبا ... نہادہ پیش خود اکسون و دیبا ...
برنگیں چھینٹ ہائے بوٹہ دارش ... فلک می آرد از انجم نثارش (۶۱ - الف)

پھر "تعریف دکان صرف" (۶۱-الف) "وصف زرگر" (۶۱-ب) "وصف جوہری بازار" (۶۱-ب) "تعریف دکان طباخ" (۶۲-الف) "مدحت دکان گلفروش" (۶۳-الف) "تعریف دکان تنبولی" (۶۳-ب)

اگر بیند بہ عاشق گاہ رخصت ... بہ صبر او بنجشد "پانِ رخصت"

خیر ان فضول جزئیات کے بعد پھر قصے میں تسلسل پیدا ہوتا ہے کہ وہ "مرغ باوفا" اجین کے راجہ کا تعارف کراتا ہے، اسکی کچھ دار باتوں سے رانی بھی غائبانہ اس کی فریفتہ ہو جاتی ہے (۶۵ - الف) جب اسے یہ علم ہوتا ہے کہ وہ جوگی بن کر یہاں آیا ہوا ہے تو ملاقات کے اشتیاق کی فراوانی وہاں جانے پر مجبور کرتی ہے، یہ بن سنور کر باغ تک جاتی ہے۔ یہاں شاعر نے باغ کی صفت میں شگوفہ کاری کی ہے، راجہ کو دیکھ کر چندر کرن بے ہوش ہو جاتی ہے، معالجے کے لیے طبیبوں کو بلایا جاتا ہے (۶۸-ب) یہ خبر سن کر رانی کا باپ غیرت سے برافروختہ ہو جاتا ہے اس کے مقرب و مصاحب اس معاملہ کو رفع دفع کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں (۷۴-الف تا ۷۵-الف) آخر کار راجہ چندر کرن کی سہیلیوں کو بلا کر اس کا حال دریافت کرتا ہے، جب کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا تو جوگی کو دربار میں حاضر کرنے کے احکام جاری کرتا ہے (۷۹ - الف) اس سے پوچھتا ہے تو کون ہے، کیا کرتا ہے، تیرا وطن کہاں ہے۔ وہ جوگی کہتا ہے :-

(۸۰-الف) بگفتا تا کہ باشد آب در گنگ بخیزد از زمیں گل آتش از سنگ...
بود اقبال و دولت بندۂ تو عدوئے جاہ تو افگندۂ تو...
(۸۱-الف) کہ ایں سرگشتہ دشت و جنوں گرد کہ دارد ہر زماں بر لب دم سرد...
زمین ہند باشد بوم و زادش ہوائے ہند باشد بامرادش
بود در ہند شہرے سر بسر زیں کہ نام نامی او آمد اجیّن،

جب راجہ کو یہ علم ہوا کہ جوگی دراصل اجیّن کا شہزادہ ہے تو اس نے اپنے وزیر سے صلاح کی۔ اس نے یہی مشورہ دیا کہ اس کے ساتھ چندر کرن کا عقد کر دینا نہایت مناسب ہوگا (۸۲-ب) راجہ نے یہ مشورہ قبول کر کے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ تمام کوچہ و بازار آراستہ کئے جائیں، اور شادی کے انتظامات نہایت شاندار پیمانے پر ہونے لگے۔ ارباب نشاط کا جمگھٹا لگ گیا، رقص و سرود کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ نجومیوں کو بلایا گیا انھوں نے اپنا حساب لگا کر عقد کے لیے ایک "ساعت سعید" مقرر کر دی (۸۶-الف) اور ان دونوں کا قران "برج وصال" میں ہوگیا۔ اس موقع پر ناقد نے کیفیتِ وصل کو پوری رعایتوں کے ساتھ بڑی نزاکت اور نفاست سے نظم کیا ہے:-

شد از نامحرماں چوں پردہ خالی درآمد عاشق و مشتاق حالی
بہ پردہ در شدند آں ہر دو مشتاق برآسودند از وصل و دو عشاق
نیاز و ناز را باز آر شد گرم برافتاد از میانہ پردۂ شرم
(۸۷-ب) گہے کردند باہم عشوہ سازی زمانے غنچہ آسا بوسہ بازی
گہے شد بوسہ زن بر نقطۂ جیم گہے زد دست بر دنبالۂ میم
(۸۸-الف) حیا را روز بازارے نماندہ حجاب و شرم را کارے نماندہ
حجاب و شرم چوں بیرون در شد کہ داند تا چہ باہم خیر و شر شد
ازیں بودہ بایں دزدیدہ دیدن وزیں پیدا لب او را گزیدن
شگفتہ غنچہ و در بستہ گشتہ حکایت ہیں بہ پردہ گفتہ گشتہ...

شادی کے بعد راجہ بہت دنوں تک چندر کرن کے دیس میں رہا اور عیش و شادمانی سے ہمکنار رہا۔ ایک دن اچانک اسے وطن کی یاد آئی اور جب وطن کا اتنا غلبہ ہوا کہ فوراً اجیّن واپس جانے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ سفر کی تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں (۸۸-الف تا ۹۵-ب) آخر ایک دن "ساعت ہمایوں" دیکھکر مع رانی چندر کرن کے وہاں سے کوچ کیا۔ اس موقع پر شاعر نے ہمیں راجہ چترکٹ کی پہلی رانی کی کیفیت بھی بتائی ہے (ورق ۱۰۵) اس کا نقشہ ملک محمد جائسی کی پدماوت میں رانی ناگمتی کے سراپا سے ملتا جلتا ہے۔ اگرچہ اتنا شاعرانہ مبالغہ اور سلیقہ کلام میں نہیں لایا گیا۔ رانی کی کیفیت کے بعد ہنس کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اس پر کیا گزری (۱۰۸-الف)۔ قصہ کا اختتام اس پر ہوتا ہے کہ راجہ اپنی نئی دلہن کو لیکر اجیّن پہونچ جاتا ہے۔ پہلی رانی بھی مسرور ہو جاتی ہے جو آتش فراق میں جل رہی تھی، دونوں رانیاں ہنسی خوشی رہنے سہنے لگتی ہیں۔ خاتمہ کے اشعار یہ ہیں:-

(۱۶۶-الف) دلا تا چند ایں بے ہودہ گوئی، براہ کجروی تا چند پوئی،
ازیں نامہ سیہ کردن ترا چیست مرا صد گریہ می آید بریں نیست

اس مثنوی کا قصہ ہندوستانی دیومالا کا مشہور اور معروف قصہ ہے۔ ناقد نے غالباً اسے بارھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں منظوم کیا ہوگا لیکن مصنف کے بارے میں یا کتاب کے سال تصنیف کی بابت متن کتاب سے کوئی تصریح نہیں ملتی۔ ناقد نے اسے سادہ و سہل زبان میں لکھا ہے اس میں صنعتوں کی کارگزاری کم ہے، بیان دلپذیر اور الفاظ نامانوس بھی نہیں ہیں۔ لیکن قصہ کے آغاز میں اتنی جزئیات سے بحث کرلی ہے کہ آخر تک اسی جوش کے ساتھ نظم نہیں کر سکا ہے، مثنوی میں اگرچہ پورا قصہ نظم ہوگیا ہے لیکن پھر بھی تشنگی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ بہرحال ہندوستانی روایتوں پر جو مثنویاں فارسی میں لکھی گئیں اُن میں ناقد کی یہ مثنوی قابل قدر ہے۔ ہندوستانی فارسی ادب کی تاریخ میں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مرزا غالب کی فارسی شاعری

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

(محمد حسین عرشی)

تعشق و تغزل عشق و محبت ایک طوفان انگیز، اور ہیجان آفرین، فطری جذبہ ہے۔ علمائے نباتات نے باہم قریب رہنے والے پودوں کو جدا رکھ کر تجربہ کیا ہے، ان کی نشو و نما کم ہو جاتی ہے، ان کی تازگی و جمال پر افسردگی چھانے لگتی ہے۔ حیوانات میں طبعًا تجاذب و تواصل کی استعداد نباتات سے بدرجہا بڑھ کر ہے، وہ اپنے ابنائے جنس بلکہ غیر جنس تک کی نفرت و اُنس میں پوری طرح امتیاز کرتے ہیں۔ مانوس اشخاص و اشیاء کے قرب و بعد سے بدیہی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ جب نباتات و انسان میں روح کی خفتگی و نیم بیداری اور احساس کے سکون و عدم بلوغ کی حالت میں یہ شراب مرد افگن اتنا تند و تیز اثر رکھتی ہے تو حضرت انسان میں یہ جذبہ جو قیامت بھی برپا کرے کم ہے، شعراء چونکہ لطافتِ حس زیادہ رکھتے ہیں اس لئے اس سے بدرجۂ غایت اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مرزا غالب جن کی نگاہ حسن کی باریک ترین اداؤں تک پہونچتی تھی جو حُسن کو خود حسن سے بہت زیادہ سمجھنے کے لئے طبعًا مجبور تھے۔ کیوں نہ اپنی تمام متاع ہستی لئے ہوئے اس سیلاب بے پناہ میں بہ جاتے! وہ عرفی کی طرح معشوق بھی تھے اور عاشق بھی، وہ حسن کی زبان تھے اور عشق کے ترجمان، وہ عشق سے زیادہ نفسیاتِ حُسن کو بیان کرتے ہیں، اس خصوص میں ان کے دماغ نے وہ نکتے اخذ کئے ہیں جن کو پیشرووں کی زبان و قلم نے مَس نہیں کیا، لیکن ان کے وقوع کی عمومیت سے انکار نہیں ہو سکتا، اعلیٰ شعر کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ اس کے مضمون کو کوئی نظم نہ کر سکے اور جب کوئی قادر الکلام نظم کر دے تو سب اُسے اپنے خیال کی ترجمانی سمجھنے لگیں۔

مرزا کی شبہائے شباب جنونِ عشق کی بادۂ تُند سے سرشار تھیں، وہ اس شعلۂ آتشیں کی حدت سے برسوں سلگا کئے۔ ان کے اس نوع کے اشعار آج بھی ایک ہنگامہ زا خروش عشق و تلاطم جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں۔ اُن کی عمیق تمناؤں اور لازوال تشنگی کو کبھی سیرابی نصیب نہ ہوئی، وہ معشوق میں فنا ہو جانے کے لئے بے تاب تھے یا اس کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتے تھے۔

متاخرین ہند اور مرزا کے معاصرین کے ہاں غزل ایک بے جان چیز ہو چکی تھی۔ علامہ آزاد بلگرامی، سراج الدین علی خاں آرزو، امام بخش صہبائی وغیرہم کی فضیلت و تبحر سے کس کو مجالِ انکار ہے۔ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ان کا تغزل مصر قدیم کی ممی شدہ نعشوں سے زیادہ نہیں کہ آرائش ظاہری کے لحاظ سے وہ سرتاپا مرصع ہے لیکن روح نہیں۔ طرفداری ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ میرزا پر اس ماحول کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

گو اُن کے کلام میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن کو صنعت گروں کے کلام میں ملا دیا جائے تو کوئی تمیز نہ ہو سکے۔ لیکن اُنکی روشنی طبع نے ان کو اس اغلاق و پیچیدگی کی تاریکیوں سے نکالنے میں بڑی مدد کی۔ شوخیِ بیان، نزاکت خیال، رشک، تاثرات فراق، تمنائے وصل وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن کو پیکر غزل کے اعضائے رئیسہ کہا جا سکتا ہے ان سب کے متعلق چند اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے معانی کی طرف اشارہ کرنے کی مجھ میں تاب نہیں:-

تو در آغوشی و دست و دلم از کار شدہ تشنہ بے دار و سن بر سر چاہے دریاب

فغانی کا مشہور شعر یاد آگیا :-

غمم ناامیدی من مگر آں زمان بدانی — کہ برون زباغ آئی و گلے نچیدہ باشی

محاکات کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیں :-

بخوابم می رسد بندِ قبا وا کردہ از مستی — ندانم شوقِ من بر وے چہ افسوں خواندہ است امشب

اپنا اور معشوق کا تعلق ؎

میرم ولے بترسم کز فرط بدگمانی — داند کہ جاں سپردن از عافیت گزینی ست
در بادہ دیر مستم آری ز سخت جانیست — در غمزہ زود رنجی آری ز نازنینی ست
من سوئے او بہ بینم داند ز بے حیائیست — او سوئے من نہ بیند دانم ز شرم گینی ست

شوخیِ بیان ملاحظہ ہو :-

ایں سخن حق بود و گاہے بر زبان ما نرفت — چوں تو خود گفتی کہ "خوباں را دل از ما راست نیست"
من آں دگر می تواں فریفت مرا — فریبش کہ گر می تواں فریفت مرا

نزاکتِ خیال :-

بخود بوقت ذبح طپیدن گناہِ من — دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہِ کیست ؟
فنا است ہستیِ من در تصورِ کمرش — چو نغمہ کہ ہنوزش وجود در تار است

مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں :-

بمرگِ من کہ پس از من بمرگ من یاد آر! — بکوئے خویشتن آں نعشِ بے کفن یاد آر
من آنیم کہ ز مرگم جہاں بہم نخورد — فغانِ زاہد و فریادِ برہمن یاد آر
ببام و در ز ہجوم جوان و پیر بکوئے — بکوئے و برزن از اندوہِ مرد و زن یاد آر

اِن کا محبوب نظیری کے محبوب کی طرح کسی اور پر عاشق ہو جاتا ہے تو اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :-

چشمش پر آب از تفِ مہر پری وشیست — من در گماں کہ از اثرِ دودِ آہ کیست ؟
ظالم تو و شکایت عشق ایں چہ ماجراست؟ — بارے بمن بگو کہ دلت دادخواہ کیست ؟
نیرنگِ عشقِ شوکتِ رعنائی تو برد — در طالع تو گردشِ چشمِ سیاہ کیست
گوید ز عجز چوں تو خدا ناشناس، حیف — با چوں خودی کہ "دادِ گیتی گواہ کیست"؟

غالب کنوں کہ قبلۂ او کوئے دلبرست
کے میرسد بدیں کہ درش سجدہ گاہ کیست

یہی مضمون ایک دوسری غزل میں ملاحظہ فرمائیے :-

در گریہ از لبِ نازکی رنج ماندہ بر خاکش نگر — واں سینہ سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر
بوقے کہ جانہا سوختے، دل از جفا سردش مبیں — شوخی کہ خونہا ریختے، دست از حنا پاکش نگر
آں کو بخلوت با خدا ہرگز نہ کردے التجا، — نالاں بہ پیشِ ہر کسے از جورِ افلاکش نگر
آں سینہ کز چشمِ جہاں مانندِ جاں پوے نہاں — اینک بہ پیراہن عیاں از روزنِ چاکش نگر
باخوئے چشم و دلش با گرمیِ آب و گلش — چشمِ گہربارش ببیں آہِ شررناکش نگر

بزم وصال کی رازداری اور نشاط و استغنا ملاحظہ فرمایئے :-

بگوشۂ بنشینم و در نہ از گینم — بہ کوچہ بر سر رہ پاسباں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم — وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

حقیقی تغزل کے چند اشعار سنئے :-

رفت آنکہ کسب بوئے تو از باد کردمی — گل دیدمے دریدے ترا یاد کردمی ...
رفت آنکہ دادائے سپاس پیام تو — ہر گونہ مرغ صد قفس آزاد کردمی

اکنوں خود از وفائے تو آزاد می کشم
رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمی

سیرم نتواں کرد ز دیدار نکویاں — نظارہ بود شبنم و دل ریگ تواں ہائے

نظارہ و دل، شبنم و ریگ، کیا نادر تشبیہ ہے۔

ایک اور غزل کے چند شعر سنئے، حسرت، امید اور آرزو کی کتنی عجیب نقاشی ہے :-

بیاد جوشِ تمنائے دیدنم بنگر! — چوں اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر!
ز من بجرم تپیدن کنارہ می کردی — بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر!
شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امید نہ ہم — ندیدنِ تو شنیدم، شنیدنم بنگر!
و صید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد — در انتظار ہما دام چیدنم بنگر!
نیاز مندیٔ حسرت کشاں نمیدانی — نگاہِ من شود و ز دیدہ دیدنم بنگر!
بہارِ من شود و گل گل شگفتنم دریاب! — بخلوتم بر و ساغر کشیدنم بنگر!

بدادِ من نہ رسیدی ز درد جاں دادم
بداد طرزِ تغافل رسیدنم بنگر!

رشک ایک طبیعی ملکہ ہے جو کم و بیش ہر انسان اور زندگی کے ہر شعبے میں پایا جاتا ہے لیکن معاملات حسن و عشق میں اس کی شدت کچھ اور رنگ کی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ رقیب کی یاد اپنے دل میں لانا نہیں چاہتے کیونکہ دل یادِ دوست کا مسکن ہے اور دونوں کی یکجائی خیال میں بھی گوارا نہیں۔

یاد از عدو نیارم آنہم ز دور بینی است — کاندر دلم گزشتن با دوست ہم نشینی است

قاصد کے سامنے محبوب کا نام لینے سے بھی جھجکتے ہیں :-

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را — رشک نگزارد کہ گویم نام را ...

یہی مضمون اُردو میں اس طرح ادا کیا ہے :-

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں ؟

خمریات میں مرزا کو بڑا شغف تھا، چنانچہ اس میں بھی اپنی ایجاد آخریں طبیعت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے، یہاں تک ظلمت کدۂ ہستی میں ان کو اگر کبھی روشنی کی جھلک نظر آتی ہے تو محض برقِ شراب کے طفیل سے :-

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا — ہلاکم جلوۂ برقِ شراب گاہ گاہی را،

عکس جمال دوست سے فروغ بادہ کو دیکھکر کیا تشبیہ پیدا کی ہے :-

نازم فروغ بادہ زعکسِ جمال دوست　　گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

آب و شراب کا امتیاز ملاحظہ ہو:-

آبش دہم ببادہ و اُو ہر دم از تمیز　　نوشدے و زجام فرو ریزد آب را

حلتِ شراب کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ نکال لیتے ہیں اور واعظ کو مخاطب کرتے ہیں:-

نگفتہ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر،　　بروکہ بادۂ ما تلخ تر ز پند است

شکوہ سنجی شکایت زمانہ مرزا کا خاص مضمون ہے اس کو اکثر بیان کیا ہے ـــــ اور ہر جگہ اسلوب بدیع اور اندازِ عجیب کے ساتھ۔ غزل، رُباعی، قصیدہ، قطعہ، مثنوی، غرض کوئی صنفِ سخن اِس سے خالی نہیں، لکھتے ہیں:-

در باغ مرادِ ما ز بیداد تگرگ،　　نے نخل بجائے ماند، نے شاخ نہ برگ

در بزمِ نشاط خستگاں را چہ نشاط　　از عربدہ پائے بستگاں را چہ نشاط

گر ابر شراب ناب بارد غالب　　اجام و سبو شکستگاں را چہ نشاط

مرزا عوام کے خلاف مشہور جرمن فلسفی شوپنہار کی طرح کسی کامیابی پر مسرور نہیں ہوتے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی مراد بر آئے تو خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ ایک اُلجھن سے نکل کے دوسری میں پھنس جاؤ گے، اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا:-

عشوۂ مرحمت چرخ فخر کیں عیار　　یوسف از چاہ بر آرد کہ بباز ار دہد

مجو آسودگی گر مرد راہی کاندریں وادی　　چو خار از پا بر آید، پا ز دامن بر نمی آید

ہنسی موجب علایق ہے اور علایق موجب مصائب، نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مصائب کی جڑ اقرارِ ہستی اور تعمیرِ ہستی ہی ہے:-

تمام زحمتم از ہستیم چہ می پرسی،　　ز جسم لاغر خویشتم بہ پیرہن خار است

علائق سے نجات چاہتے ہیں لیکن کامیابی کہاں:-

دامن افشاندم بجیب و ماندہ در بند تنم　　وحشتے کو تا برون آرد ز عریانی مرا؟

ہفت آسماں بگردش و ما در میانہ ایم　　غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود؟

بخت بد کی یہ تاثیر ہے کہ کوثر خشک ہو جائے اور طوبیٰ پر بھی خزاں آجائے:-

کوثر اگر بمن رسد، خاک خورم ز بے نمی　　طوبیٰ اگر ز من شود، ہیمہ کنم ز بے بری

مراثی مرثیہ میں چند قصاید اور متعدد قطعات و ترکیب بند لکھے ہیں۔ جن میں مضمون کی ندرت کے ساتھ ساتھ درد و اثر کی فراوانی ہے غالب کو آج تک مرثیہ گو کی حیثیت سے بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالانکہ ان مراثی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اندوہ و ماتم کے مضامین کو بیان کرنے پر بھی انھیں کافی قدرت حاصل تھی، ملاحظہ فرمایئے۔ شاہزادہ کا مرثیہ لکھتے ہیں:-

اے دل بچشم زخم حوادث نگار شو!　　اے چشم از ترا دشِ دل اشکبار شو!

اے خاک چرخ گر نتواں زد ز جا درآ!　　اے چرخ خاک گر نتواں شد غبار شو!

اے نو بہار چوں تنِ بسمل بخوں بغلط!　　اے روزگار چوں شبِ بے ماہ تار شو!

اے ماہتاب روئے بہ سیلی کبود کن!　　اے آفتاب داغِ دلِ روزگار شو!

آہ ایں چہ سیل بود کہ ما را ز سر گزشت
تنہا ز سر نگو کہ ز دیوار در گزشت

اے قوم خویش را بشکیب امتحاں کنید!　　ایں کار را بشیوۂ کار آگہاں کنید!

طفل است شاہزادہ و در رہ خطر بسی ست — منعش ز عزم رہبریٔ آنجہاں کنید !
از میوہ و گل آنچہ دلش خواہد آں دہید — از حیلہ آنچہ رائے شما باشد آں کنید !
در خود ز رفتنش نتوانید باز داشت — بیخود شوید و جامہ درید و فغاں کنید !

اے اہلِ شہر مدفنِ ایں دودماں کجاست ؟
خاکم بفرق خواب گہِ خسرواں کجاست ؟

زاں سبز خط کہ بر رخِ او نادمیدہ ماند — گردے بدل نشست و غبارے بدیدہ ماند
در مدح شاہزادہ سخن ہائے دلپذیر — در دا کہ ہم نگفتہ و ہم ناشنیدہ ماند
اخلاقِ شاہزادہ بود دلنشینِ خلق — بوئے ز آں شگفتہ گل نو رسیدہ ماند

آں سرو سایہ دار کہ بارش نبود کو ؟
واں نو گلِ شگفتہ کہ خارش نبود کو ؟

دستی ست اے سپہر ترا در ستمگری — بارے برم ز جور تو پیش کہ داوری
نیرنگ ساز چرخ کہ بیداد خوئے اوست — با گل کند سمومی و با شاخ صرصری
داغم ز روزگار کہ شہزادہ برخورد — از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہری

زیبائی و جوانیِ فرخندہ شاہ حیف
آں نو نہال سرو قدِ کجکلاہ حیف

شہزادے سے خطاب کرتے ہیں :-

اے رہ نوردِ عالم بالا چگونۂ ؟ — ما بے تو در ہمیم تو بے ما چگونۂ ؟
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی — با حوریانِ آئینہ سیما چگونۂ ؟
با بیخوداں بحلقۂ ماتم نشستہ ایم — از خویشتن بگوئے کہ تنہا چگونۂ ؟
بے مطرب و ندیم و غلامانِ خرد سال — بے باغ و قلعہ و لبِ دریا چگونۂ ؟

اے بعد مرگ راتبہ خوارِ تو عالمی
پروانۂ چراغ مزارِ تو عالمی

امام حسین علیہ السلام کے مرثیے میں جو سینہ کوبی و اشک ریزی کی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں تکلف ہے ۔ دیکھئے :-

اے فلک شرم از ستم بر خاندانِ مصطفےٰ ! — داشتی زیں پیش سر بر آستانِ مصطفےٰ
اے بمہر و ماہ نازاں ہیچ میدانی چہ رفت ؟ — از تو بر چشم و چراغ دودمانِ مصطفےٰ
سایہ از سرو ردانِ مصطفےٰ نفتد بخاک — ہاں چہ بر خاک افگنی سروِ روانِ مصطفےٰ
گرمیٔ بازار امکانِ خود طفیلِ مصطفےٰ است — ہیں چہ آتش میزنی اندر دکانِ مصطفےٰ
کینہ خواہی ہیں کہ با اولادِ امجادش کنی — آنچہ با مہ کردہ اعجاز بنانِ مصطفےٰ
یا تردانی مصطفےٰ را فارغ از ذبح حسین — یا تو خواہی زیں مصیبت امتحانِ مصطفےٰ
یا مگر گاہی ندیدی مصطفےٰ را با حسین — یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفےٰ
آں حسین است ایں کہ سودی مصطفےٰ چشمش برخ — بوسہ چوں باقی نماندے در دہانِ مصطفےٰ

آں حسین است اینکہ گفتی مصطفےٰ روحی فداک — چوں گزشتی نام پاکش بر زبانِ مصطفےٰ
اے کج اندیشہ فلک حرمتِ دین بائستی! — علمِ شاہ نگوں شد نہ چنیں بائستی
تا چہ افتاد کہ بر نیزہ سرش گردانند — عزتِ شاہِ شہیداں بہ ازیں بائستی
حیف باشد کہ فتد خستہ ز توسن بر خاک — آنکہ جولاں گہ اورا سرِ زیں بائستی
حیف باشد کہ ز اعدادم آبی طلبد — آنکہ سایل بدرش روحِ امیں بائستی
سخن اینست کہ در راہِ حسین ابنِ علی — پویہ از روئے عقیدت بہ جبیں بائستی
با اسیرانِ ستم دیدہ پس از قتلِ حسین — دلِ نرم و منشِ مہر گزیں بائستی

چہ ستیزم بقضا ورنہ بگویم غالب
علم شاہ نگوں شد، نہ چنیں بائستی

مناظرِ فطرت منظر یہ شاعری کی ایجاد کا سہرا اگرچہ انگریز شعرائے مغرب کے سر سمجھا جاتا ہے، لیکن غالب اس خصوص میں اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، بعض قصاید کی تشبیبیں یکسر بہار کی تصویر کشی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

خیز تا بنگری بشاخِ نہال — طوطیانِ زمردیں تمثال
گاہ مرجان دانندہ از منقار — گہ زبرجد فشاندہ از پر و بال

قصیدہ پنجم کی تمہید میں مرزا نے جو کچھ لکھا ہے، جہاں تک میرا مطالعہ ہے کسی پیشرو کا شرمندۂ تقلید نہیں :-

خیزند دستہ دستہ مغانِ نہ شستہ روئے — در اہتمامِ چیدنِ برسیمِ زنار و ن،
رخشد ستارہ از رخِ ناشستۂ صنم — بالد بنفشہ از قدِ خم گشتۂ شمن
خوابد چراغ کشتہ چو شخص بریدہ سر — خیزد گلِ شگفتہ چو رنجور خستہ تن

مثنوی چراغ دیر میں نازنینانِ بنارس کا ذکر ملاحظہ ہو :-

میاں با نازک و دلہا توانا، — زنادانی بکارِ خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعی ست — دہنہا رشکِ گلہائے ربیعی ست
قیامت قامتاں مژگاں دراز — زمژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں

ہجو مرزا ہجو سے اگرچہ پرہیز کرتے ہیں، لیکن اگر کبھی اس پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو دلوں میں کانٹے توڑ جاتے ہیں، مثلاً :-

"ہجو تو ناقابلی در صلب آدم دیدہ بود — زاں سبب ابلیس ملعوں سجدہ بر آدم نکرد"
حاش للہ بودنت در صلب آدم تہمتست — پیش ہر کس گفتم ایں اندیشہ باور ہم نکرد

میرے خیال میں ہجو کا یہ انتہائی درجہ ہے، اور لطف یہ ہے کہ شفائی و سوزنی کی طرح عریاں الفاظ کا شائبہ تک نہیں

مزاح مرزا کی ہر بات سے ایک سنجیدہ ظرافت اور فلسفیانہ مزاح ٹپکتا ہے، اس میں بھی عجیب و غریب نکتے پیدا کئے ہیں۔ مشہور ہے کہ ازدواج و خانہ داری موجبِ مصائب آلام ہے۔ اس قید سے آزادی و بے فکری مفید صحت و قوت ہے اس خیال سے کیا نادر نتیجہ نکالتے ہیں

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود — از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بہ جہاں خانہ و زن نیست درد — نازم بخدا، چرا توانا نبود

افلاس کے سبب صوم و صلوٰۃ کے کبھی متحمل نہیں ہو سکتے، شرع میں ترمیم چاہتے ہیں :-

در عالمِ بے زری کہ تلخ ست حیات — طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰۃ — بودے بہ وجودِ مال چوں حج و زکوٰۃ

حافظ غلام رسول شوق

(محمد انصار اللہ نظر)

میں نے اپنے مضمون بہ عنوان "ذوق کا استاد کون تھا؟" شایع شدہ ماہنامہ "نگار" لکھنؤ بماہ اگست سنہ ۱۹۶۰ء میں خیال ظاہر کیا تھا کہ آزاد کا یہ قول کہ ذوق نے ابتداءً حافظ غلام رسول شوق سے مشورۂ سخن کیا، قابل قبول نہیں تاوقتیکہ کوئی معتبر شہادت آزاد کی تائید میں نہ ملے۔ مخدومی جناب قاضی عبدالودود صاحب کا احسان مند ہوں کہ جناب موصوف نے اس سلسلہ میں مجھے حقیقت سے آگاہ کیا لکھتے ہیں :-

"اسپرنگر کی فہرست کے مطابق تذکرۂ سرور میں شوق کا شاگرد ہونا مرقوم ہے۔ تذکرۂ مذکور اس وقت پیشِ نظر نہیں لیکن مجھے یاد آتا ہے کہ اس میں ہے"۔

حال ہی میں مجھے شبلی اکیڈیمی اعظم گڑھ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں بعض قابل قدر تذکرے بھی دیکھنے کا موقع ملا، چنانچہ اب میں ذیل کی سطور میں اپنے پہلے قیاس کی توضیح شایع کر رہا ہوں، قارئین سے توقع ہے کہ وہ ان سطور کو مضمون مذکور کی دوسری قسط یا اس کا تتمہ خیال کریں گے۔ میں محترم صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا بھی اس مضمون کے سلسلہ میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کیونکہ موصوف نے زحمت فرما کر ضروری کتابیں شبلی اکیڈیمی کے کتبخانہ سے اپنے نام (Issue) ایشو کرا کر عنایت کیں۔ نظر

حافظ غلام رسول شوق دہلی کے باشندے اور غالباً کسی غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے، بقول صاحب گلستانِ سخن سنہ ۱۲۷۱ھ میں ان کی عمر ستر برس کے قریب پہونچ چکی تھی (گلستان سخن :- ۲۹۲) اور لالہ سری رام کے قول کے مطابق سنہ ۱۲۷۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا (خمخانۂ جاوید ۵/۷۸) اس لحاظ سے ان کی ولادت سنہ ۱۲۰۲ھ کے قریب سمجھی جانی چاہئے۔

شوق، حافظ قرآنِ پاک تھے اور ولی عہد بہادر میرزا ابوظفر ظفر نے ان کو عزیز آبادی کی حویلی کی مسجد میں بچے پڑھانے کی خدمت پر مامور کر دیا تھا، اس طرح یہ فاقوں کی آفات سے مامون رہتے تھے (گلشنِ بے خار ۱۱۲) بقول میرزا فرحت اللہ بیگ یہ مسجد عزیز آبادی میں امامت بھی کرتے تھے (دہلی کی آخری شمع ۸۸) نہیں کہا جا سکتا کہ ولی عہد بہادر کی نگاہ التفات سے فیضیاب ہونے سے پیشتر حافظ صاحب کا مشغلہ کیا تھا، کیونکہ تذکروں میں اس کا ذکر نہیں ملتا اور نہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کس زمانہ میں ولی عہد بہادر ان پر مہربان ہوئے تھے، خیال کیا جا سکتا ہے کہ ابتداءً کابلی دروازے میں رہتے ہوں گے، لیکن اس کے لئے فی الحال کوئی سند نہیں ملتی۔

حافظ صاحب شاعر بھی تھے، لالہ سری رام ان کے بڑے مداح معلوم ہوتے ہیں، ان کے کلام کے متعلق اس طرح رائے زنی کرتے ہیں:

"طبع رسا اور فکر رنگین رکھتے تھے، استاد (شاہ نصیر الدین نصیر) کی طرح سنگلاخ زمینوں میں کئی کئی غزلیں کہہ کر پہاڑ کو چیر کر جواہر آبدار نکالتے ہیں، خداداد ذہن اور زور طبیعت سے پتھر کو پانی کر دکھاتے ہیں، مشاق اور باکمال شاعر تھے، روزمرہ زبان اور محاورات کی اصلیت کے ماہر تھے، جب استاد کے طرز سے الگ ہو کر کہتے تو بیان سادگی اور سلاست سے مربوط ہوتا، نکتہ سنج، معنی طراز اپنے معاصرین میں ممتاز۔۔۔۔ کلام پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ایک ماہر فن کو

یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آپ کو روزمرہ اور محاورات انتخاب کرنے کا خداداد ملکہ تھا اور انھیں صرف کرنے کا عمدہ سلیقہ آپ کے فیض صحبت سے حضرت ذوق کو یہی بات ہاتھ آگئی تھی ..... زبان کے بہترین نمونے ان کے کلام فصاحت نظام میں موجود ہیں۔" (خمخانۂ جاوید ۵/ ۷۷، ۷۸)

لیکن عجیب بات ہے کہ حافظ صاحب کے دیکھنے والے ان کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے، مرزا قادر بخش صابر کا بیان اس سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتا ہے :-

"شوق تخلص، حافظ غلام رسول شاگرد شاہ نصیر مرحوم، عہد طفولیت سے اب تک باوجودیکہ سنین عمر شصت کے قریب پہونچے، مشق سخن میں مصروف ہے، مشکل زمینوں میں بمشیر گامزن اور قوافی تنگ میں اکثر گرم سخن ہے جو کہ اشعار عاشقانہ و دلچسپ یا تشبیہ و تمثیل ایسی کہ مذاق شاعری میں گوارا ہو اس کے نتائج طبع سے کم کیا کہ مطلق مسموع نہیں ہوئے، ناچار ایک شعر کہ بہ نسبت اور اشعار کے فی الجملہ حلیہ صفا سے محلی تھا مرقوم ہوا ؎

رنگے پاؤں میں چبھتے ہیں نزاکت سے فرش مخمل پہ وہ گلرو جو قدم رکھتا ہے" (گلستانِ سخن ۲۹۲)

مولانا محمد حسین آزاد کا قول بہت دلچسپ ہے کہ :- "اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے" (آب حیات ۵۴۴)

بقول آزاد ان کے اشعار سن کر نواب معروف نے کہا تھا کہ :- "کان بدمزہ ہوگئے۔" مرزا فرحت اللہ بیگ نے دہلی کی آخری شمع میں اپنے تاثرات کا بیان اس طرح کیا ہے :-

(شوق) بے چارے بڑھے آدمی ہیں، شاہ نصیر کے شاگرد ہیں، مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں شروع میں استاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا اسی برتے پر یہ اپنے آپ کو ان کا استاد کہا کرتے ہیں اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیں، مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں" (۸۸)

اس کے برخلاف نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بہت متوازن رائے قایم کی ہے کہ :-

"نسبت شاگردی بہ شاہ نصیر دارد، اکثر کلامش بہ طرز استاد خود است" (گلشن بیخار - ۱۱۳)

حافظ صاحب کو شہرت، ناموری اور استاد کے کہے جانے کا بڑا شوق معلوم ہوتا ہے، ذیل کے دو مقطعے اس سلسلہ میں ملاحظہ ہوں

استاد نصیر اب یہ تفضل سے تمھارے ہوتا چلا عالم میں سخن عام ہمارا

کہئے نہ کیونکہ طوطیٔ ہند آج تجھ کو شوق خسرو کی صاف نکلے ہے تیرے سخن سے بو

اور غالباً یہی سبب تھا کہ خود کو ذوق کا استاد کہتے تھے، حالانکہ تذکرہ نویسوں نے حافظ صاحب کے اس قول کو لایعنی سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور ذوق کو شاہ نصیر کا شاگرد تسلیم کیا، البتہ میر محمد خاں سرور المخاطب بہ اعظم الدولہ نے ۱۲۱۶ھ میں جب ذوق کی عمر کل بارہ سال تھی، ایک تذکرہ شعرائے اردو کا لکھنا شروع کیا، اس میں انھوں نے ذوق کو حافظ شوق کا شاگرد لکھا ہے جیسا کہ ڈاکٹر اسپرنگر کی حسب ذیل تحریر سے ثابت ہے :-

"ذوق شیخ محمد ابراہیم، ساکن دہلی، یہ ایک نوجوان شاعر اور شوق کے شاگرد ہیں (تذکرہ سرور) یہ ہندوستان کے خاقانی کہلاتے ہیں ....." (یادگار شعراء: ۹۲)

سرور کے بعد میر قدرت اللہ قاسم نے ایک تذکرہ (مجموعہ نغز) لکھنا شروع کیا جو ۱۲۳۱ھ میں مکمل ہوا اور اس وقت ذوق کا سن سترہ سال کا تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں :-

"ذوق تخلص نوشتے ست از شاگردان محمد نصیر الدین نصیر کہ گاہ گاہ در مجلس شعرا حاضری شود و غزل طرحی ہم سرانجام می دہد" (۳۸۵)

گویا سترہ سال کی عمر کے قریب ذوق کا شاہ نصیر سے تلمذ ثابت ہے اس سے پہلے ان کو نوجوان کہنا مشکل ہوگا، اور غالباً اسی لئے آزاد نے اس زمانہ کو "لڑکپن" سے تعبیر کیا ہے (دیوان ذوق: ۱۰۴) معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں سرور نے اپنے تذکرہ (عمدۃ المنتخب) کی ابتدا کی، ذوق طفل مکتب کی حیثیت سے حافظ شوق کے یہاں حاضر ہوتے تھے اور یہیں شعر کا شوق پیدا ہوا، اس سے آزاد کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ

"جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے، محلہ کے اکثر لڑکے انھیں کے پاس پڑھتے تھے، انھیں بھی وہیں بٹھا دیا... شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہوگئے... حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے" (دیوان ذوق: ۲ تا ۳)

آزاد کے اس بیان میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ انھوں نے حافظ شوق کو "بادشاہی حافظ" کہا ہے، اور بادشاہی حافظ ہونے کا زمانہ اغلباً بعد کا ہوگا کیونکہ ولی عہد بہادر نے ان کو مسجد عزیز آبادی میں تعینات کیا، اور اسی مسجد میں وہ اواخر تک رہے۔ یقیناً اگر کابلی دروازہ کی کسی مسجد میں وہ مکتب پڑھاتے ہوں گے تو اس سے قبل کے زمانہ میں ہی ممکن ہے اور اُس وقت وہ بادشاہی حافظ نہیں کہے جاسکتے تھے، شاید آزاد نے اپنے زمانہ میں حافظ صاحب کو جیسا دیکھا ویسا ہی لکھ دیا۔

اب ایک خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ شوق جو تمام زندگی مشق سخن کرنے کے بعد بھی کوئی ایسا شعر نہ کہہ سکے جسے واقعی ادبی اہمیت حاصل ہوتی اور جس کی بدولت دنیائے ادب میں وہ نام پاتے، وہ ذوق جیسے خوش فکر اور تیز طبع کے استاد کیونکر ہو سکے ہوں گے خصوصاً جبکہ عمروں کا تفاوت بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس کا جواب ہمیں اُس وقت مل جاتا ہے جب ہم حافظ شوق کے بعض دوسرے تلامذہ کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں، یہاں شاہزادہ کریم الدین رسا کے متعلق میرزا قادر بخش صابر کے بیان کے نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں:-

"رسا تخلص شاہزادہ والا مراتب مرزا کریم الدین بہادر سنین عمر قریب ستر کے پہونچے ہیں..... اوایل عمر سے اب تک اپنا سخن حافظ غلام رسول شوق کے زیور اصلاح سے مزین کیا ہے" (گلستانِ سخن: ۲۴۲)

اس لحاظ سے رسا اپنے استاد شوق کے بالکل ہم سن معلوم ہوتے ہیں، خیال ہے کہ حافظ شوق نے تنگدستی کے سبب بہت کم عمری ہی سے لڑکے پڑھانے شروع کر دئے تھے، ذوق کے والد بھی غریب تھے، بچے کی تعلیم کا معقول انتظام نہیں کر سکتے تھے چنانچہ محلہ کے اور بچوں کے ساتھ ان کو بھی حافظ شوق ہی کے پاس پڑھنے بھیج دیا ہوگا، ذوق ذہین تھے کم عمری سے پڑھنا شروع کیا، شوق ان سے تین سال بڑے تھے، چنانچہ عمر کے اس فرق کے سبب اس لایق ہوگئے ہوں گے کہ ان کو تعلیم دے سکیں، اس سلسلۂ تلمذ کے لئے ابھی بعض جزوی تفصیلات اور درکار ہیں تاکہ اس کی واقعیت کی قطعی تحقیق ہو سکے، موجودہ صورت حالات میں یہی بات اس واقعہ کو مشکوک بنا دینے کے لئے کافی ہے کہ شوق کا ذکر نہ مجموعہ نغز میں ہے نہ ڈاکٹر اسپرنگر کی فہرست میں، گویا ۱۲۵۲ھ تک ان کو وہ شہرت بھی حاصل نہ تھی جو ذوق کو حاصل تھی کیونکہ ان دونوں میں ذوق کا ذکر موجود ہے، شاگرد اور استاد کے درجۂ قبولیت کا یہ فرق بہت اہم ہے اور اس کے لئے مجموعۂ نغز سے پہلے کے تذکروں کا مطالعہ ضروری ہے اور ڈاکٹر اسپرنگر کی فہرست کے علاوہ کسی دوسری شہادت کی تلاش بھی کرنی چاہئے تاکہ ذوق کا تلمذ قطعیت سے ثابت ہو سکے۔ حافظ شوق کے دوسرے تلامذہ میں بھورے خاں آشفتہ بھی قابلِ ذکر ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی استادی کے درجہ کو پہونچا تو کجا اپنے عہد کے قابل قدر شعراء میں بھی نہ ہو سکا۔

حافظ شوق کا دیوان طبع نہیں ہو سکا البتہ لالہ سرسیرام کے کتب خانہ میں ان کا ایک ناتمام قلمی دیوان موجود تھا معلوم نہیں دستبرد زمانہ سے محفوظ رہا یا ضایع ہوگیا۔ ان کے اشعار جو رنگترے کی تعریف میں ہیں دہلی کے میوہ فروشوں سے سنے جاسکتے تھے مگر اب ان باتوں کو عرصہ گزریں اور یہ سب واقعات قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئے:-

مزا انگور کا ہے رنگترے میں، عسل زنبور کا ہے رنگترے میں
ہیں اشعار ہلالی اس کی پھانکیں یہ مضموں دور کا ہے رنگترے میں
نہیں ہے ان کی پھانکوں میں یہ زیرا یہ لشکر مور کا ہے رنگترے میں
مزاج اب جس کا صفرادی ہے اے شوق دل اس رنجور کا ہے رنگترے میں

میر باقر علی داستان گو

(سید یوسف بخاری، دہلوی)

میر باقر علی ۱۸۵۰ء میں دلی میں پیدا ہوئے، اُن کے والد کا نام میر حسین علی تھا۔ ایرانی نژاد تھے، ابھی کمسن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ماں کی آغوش اور اپنے نانا امیر علی عرف میر پیڑا (قصہ گو قلعہ معلیٰ) کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی جو اُن دنوں ڈوموں کی گلی واقع ترکمان دروازہ، دہلی میں رہا کرتے تھے۔ سات برس کے ہوئے تو ناگہاں دہلی میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ وغا برپا ہوا۔ اس افراتفری اور مار دھاڑ کے زمانہ میں اپنی والدہ اور نانا کے ہمراہ واقع شاہراہ قطب (مہرولی) مقبرہ صفدر جنگ دلی پہونچ کر پناہ لی۔ جب امن بحال ہوا اور شہر میں امی جمی ہوئی تو واپس آئے۔ ابتدا میں محلہ فراش خانہ میں آباد ہوئے۔ عمر کے آخری ایام میں پہاڑی کھوجلا پر سکونت اختیار کی۔ ۷۸ برس کی عمر پائی۔ ۱۹۲۸ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

میر امیر علی کے بعد جو غدر کی کھکھیڑ اُٹھا کر کچھ مدت بعد چل بسے تھے، باقر علی نے باقیات میں صرف اپنے حقیقی ماموں میر کاظم علی کو پایا۔ میر کاظم علی اپنے وقت کے طوطیٔ رنگیں بیاں اور بلبلِ ہزار داستاں تھے۔ ہم نے تو نہ اُنھیں دیکھا اور نہ سنا، ہاں جن بڑے بوڑھوں نے انھیں دیکھا اور سُنا، اُن سے معلوم ہوا کہ میر کاظم علی جب داستان چھیڑتے تو اُن کی مقراض زبان گل کترتی اور لب شکر ریزی کرتے تھے۔ اُن کی شہرت اُنھیں کشاں کشاں دکن لے گئی۔ ہر چند کہ اُن کے خمیر میں دلی کا آب و گل تھا لیکن سر آسماں جاہ بہادر کی قدر دانی اور وہاں کی آب ہوا کچھ ایسی راس آئی کہ اسی خاک کا پیوند ہو گئے۔

اُنہی میر کاظم علی سے میر باقر علی نے داستان گوئی کا فن حاصل کیا اور اس میں ایسے طاق ہوئے کہ دوسروں کو طاق پر بٹھا دیا۔ ان کی اولاد میں ایک صاحبزادی باقری بیگم تھیں، تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان آئیں۔ ۱۹۵۲ء میں وہ بھی چل بسیں۔ مرحومہ کی یادگار اُن کے دو لڑکے سید رضی حسین اور سید شہنشاہ حسین ہیں جو اس وقت زیر تعلیم ہیں۔

ہم نے میر باقر علی کو سب سے پہلے اپنے لڑکپن میں دلی کے عربک اسکول، اجمیری دروازے میں دیکھا۔ اُس وقت ہم چھٹی جماعت میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ ۱۹۱۹ء کا ہنگامہ خیز زمانہ تھا اور میر صاحب کی داستان گوئی کا بازار بھی خاصا ٹھنڈا پڑ چکا تھا، لیکن میر صاحب بھلا اس سرد بازاری سے کب مار کھانے والے تھے۔ حکیم اجمل خاں کی شہ پاکر کئی داستانیں دھر کھسیٹیں، میر صاحب کی رسم و راہ اُن کے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں سے بھی تھی جو گاہ بگاہ اپنے دیوان خانہ میں میر باقر علی سے داستان سُنا کرتے تھے، حکیم اجمل خاں کے الطاف و اکرام کی صورت یہ تھی کہ میر صاحب جب ضرورت مند ہوتے تو دو چار سیر چھالیا کی ایک پوٹلی میں لیکر حکیم صاحب کی خدمت میں پہونچ کر عرض کرتے "حکیم صاحب کچھ چھالیا لایا ہوں، اگر پہلی چھالیا ختم ہو گئی ہو اور اس وقت ضرورت ہو تو حاضر ہے"۔ حکیم صاحب فرماتے۔ "میر صاحب میں تو کئی دن سے آپ کا منتظر تھا اچھا ہوا آپ آ گئے چھالیا گھر میں بھجوا دیجئے گا، ذرا دیکھئے اپنی خالی پوٹلی ابھی لیتے جائیے گا"۔

یہ پوٹلی حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق زنان خانے سے بظاہر بالکل خالی آئی لیکن دراصل نوٹوں سے پُر ہوتی، رخصت ہوتے وقت حکیم صاحب فرماتے۔ "میر صاحب فرصت ہو تو آیندہ اتوار کو اپنی باقی ماندہ داستان پوری کر دیجئے"، لیکن داستان پوری نہ ہونی تھی اور نہ ہوئی۔ دلّی کے مشہور رئیس لالہ چھنّامل بھی میر صاحب کے دلدادہ اور قدر دان تھے۔ ایک مدت تک وہاں سے بھی اُن کو چالیس پچاس روپیہ ماہوار داستان گوئی کا نذرانہ ملتا رہا۔ چھنّامل والے بھی یہی کہا کرتے تھے کہ ہم کو داستان سنتے سنتے بیس بائیس برس گزر گئے لیکن داستان آج تک ختم نہ ہوئی۔

میر صاحب مرحوم کے بقول "داستان کہنے والے کی عمر کوتاہ اور سننے والوں کی عمر دراز"۔ اُن کا ذکر بھی داستان سے کم نہیں۔ جس روز ہم نے اُن کا پہلی مرتبہ دیدار کیا، بہت دور سے اُچٹتا ہوا دیکھا تھا، کیونکہ عربک اسکول کے صدر دروازے کے اندرونی محراب کے نیچے جلو اساتذہ اور طلاب کا جم غفیر دربار خلافت میں جمع تھا جہاں ہمارے میر صاحب "گاڑھے خاں" کے روپ میں، چندے آفتاب چندے ماہتاب سیمیں بدن، گل پیرہن، شریک حیات، محرم وہم راز، آفت خانہ، فتنۂ زمانہ بی ململ جان کو اپنی طلاقت زبان سے طلاق بائن دے رہے تھے۔ ہندوستان بھر میں بدیشی مال کی دھجیاں بکھر رہی تھیں۔ گھر گھر سے ململ جان کو در در ہونے لگی اور دیس نکالا ملنے لگا۔ آخر حکومت نے ان دونوں رسالوں کی اشاعت و فروخت پر خفیہ پابندی لگائی۔ بڑی خیر ہوئی کہ میر صاحب کو اس مطلقہ بندی، ململ جان کی طلاق کی پاداش میں بندی خانے نہ بھیجا۔

میر صاحب اسکولوں، کالجوں اور دلّی کے رؤسا کے یہاں تو مدعو ہوتے ہی تھے لیکن ہفتے میں ایک بار وہ خود اپنے گھر پر بھی ۹ بجے سے ۱۲ بجے شب تک داستان سنایا کرتے تھے۔

کچھ دنوں ریاست پٹیالہ میں داستان سنانے کے لئے ملازم بھی رہے، لیکن میر صاحب جہاں گئے اُنھوں نے اپنی آن بان اور خودداری کو کبھی ٹھیس نہ لگنے دی۔ جہاں کسی رئیس نے اپنی اکڑفوں دکھائی یا ذرا اپنے جامے سے باہر ہوا تو میر صاحب نے اول تو اُسی وقت ترکی بترکی جواب دے کر اُسے لاجواب کر دیا ورنہ داستان گوئی کے وقت داستان کے پردے ہی میں اُس کی ایسی تیسی کر ڈالی۔ ایک دربار میں جب اول بار طلب ہوئے تو صافہ باندھ کر حاضر ہونے کا حکم ملا۔ میر صاحب کو بھلا اس شرط کی کہاں تاب تھی۔ ناظم نواب رامپور سے انکار کر کے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ وہ غریب اپنی ملازمت کی بقا کے لئے دوڑا دوڑا پیچھے آیا، بار بار منت سماجت کی۔ اسکی گریہ وزاری پر میر صاحب نیم راضی ہو گئے۔ صافہ باندھنا تو منظور کر لیا لیکن دربار میں داخل ہوتے وقت صافہ اس شان سے باندھا کہ وہ آدھا سر پر تھا اور آدھا بغل میں اور وہ بھی بار بار میر صاحب کی قدم بوسی کرتا تھا۔ راجہ میر صاحب کو بایں ہیئت کذائی دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑا سمجھ گیا کہ دلی کا میر ہے اور اپنے فن کا امیر۔ امیر، امیر سب برابر۔ مجبوراً کہنا پڑا کہ با! آپ جس طرح چاہو یہاں آؤ۔

علی گڑھ میں آپ نواب محمد اسحاق کے ہاں داستان سنایا کرتے تھے۔ میر صاحب نے اپنی داستان گوئی میں عالمانہ شان اور وقار پیدا کرنے کے لئے مختلف علوم وفنون میں اس طرح معلومات حاصل کیں کہ باقاعدہ داخلہ تو نہیں لیا لیکن مسجد فتح پوری اور طبیہ کالج دہلی وغیرہ میں ایک مدت تک طلبا کے درمیان بیٹھ کر اُن کے اسباق کو بغور سنتے اور نوٹ کرتے رہے۔ چنانچہ طب اسلامی کے نصاب کی فلسفہ، ریاضی، ادب، نفسیات، منطق، فلکیات وغیرہ کے متعلق اتنی معلومات اکٹھی کر لیں کہ داستانوں میں ان علوم کے نکات سن کر میر صاحب کے متعلق یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید انھیں ان علوم وفنون میں بھی دسترس حاصل ہے۔

داستان گو کا حافظہ تو ویسے ہی قوی ہوتا ہے لیکن میر صاحب کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ پوری داستان حمزہ اور نہ معلوم ایسی کتنی داستانیں اُن کو ازبر تھیں۔ کفر و اسلام کی جنگ آزمائیاں، حسن وعشق کی کارفرمائیاں، طلسم کشائیاں اور مختلف کرداروں کی عیاریاں بیان ہوتی تھیں۔ دلی سے لے کر اپنے وقت کے مشہور شعراء فارسی و اردو کے اکثر اشعار مناسب موقع ومحل پر استعمال کیا کرتے تھے۔ انھوں نے چھوٹی موٹی داستانیں خود بھی لکھیں۔ داستان گوئی کا یہ عالم تھا کہ تلفظ، الفاظ کی

اونچ نیچ کو چھوڑ کر وہ اپنی آواز کے زیر و بم، لب و لہجہ کے اُتار چڑھاؤ اور موقع و محل کی مناسبت سے ہر متنفس کی حرکات و سکنات کی ایسی کامیاب نقل اُتارتے کہ خود تصویر بن جاتے تھے۔ زمین ہو یا آسمان، انسانوں کی بستی ہو یا دیوؤں، پریوں اور حیوانات کا مسکن، جملہ مناظر۔ بزم ہو یا رزم ماضی کی شوکت و عظمت، اسلاف کے کارنامے، قوموں کے عروج و زوال کے افسانے، دنیا کی بے ثباتی۔ خواص و عوام کی زندگی، معاشرت، رسوم و رواج کی جھلکیاں، حسن و عشق کی کارفرمائیاں، دنیا جہان کی استعمالی اشیاء اُن کے نام، چہرہ مہرہ، خواص انسانی حیوانی سراپے، خاکے، نظم و نثر میں دلی کی ٹکسالی زبان میں اس طرح بیان کرتے کہ کہیں ہچکی نہ لیتے، کسی میدان میں جھول نہ آتا داستان گوئی کے پردے میں قوم کی حالت بتا کر روشن مستقبل کی راہ سمجھاتے۔ سنگیت پر اُن کو عبور حاصل تھا۔ بعض اوقات گویوں کو اُن کی لغزش پر ٹوک دیتے۔ کوئی شامت کا مارا اکڑتا یا بگڑتا تو موسیقی کے قانون اور اُصولوں سے اُس کو اُسی وقت چکت کر دیتے۔ قاری سرفراز حسین دہلوی مرحوم کو اُن کے ایک ناول "سزائے عیش" کے لئے ہیجڑوں کی لڑائی کا ایک باب لکھ کر دیا تھا وہ اُس میں شامل ہے

راقم نے کئی بار اپنے والد کے ہمراہ حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے میں اُن کی داستانیں سنیں، مگر یاد رکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ میر صاحب کے کچے یا پکے آدھے یا چوتھائی برائے نام دو شاگرد بھی ہوئے۔ اول شاگرد خود اُن کی صاحبزادی تھیں، اُنھوں نے اپنے باپ سے اس فن میں تھوڑا بہت ملکہ حاصل کیا تھا۔ وہ اب چل بسیں۔ دوسرے شاگرد میرے قدیم مشفق ذوالفقار علی بخاری صاحب ہیں۔ اُن کی داستان کا صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا نذر ناظرین ہے جو بخاری صاحب کی یادداشت کا ثمرہ ہے اور میری صرف کوری نقل۔ اسکے علاوہ تین اور مختصر حکایتیں کہ یہ بھی داستانیں نہیں ہیں بلکہ اُن کی مشہور کتاب "کانا باتی" کی مختصر حکایتیں ہیں، آگے نقل کر دی گئی ہیں۔

حکیم اجمل خاں کا دیوان خانہ ہے، سفید براق مکلف فرش ہے۔ قالینوں کے ساتھ سہارے کے لئے تکیے لگے ہیں۔ دیواروں پر جا بجا مشہور خطاطوں کی وصلیاں اور کتبے آویزاں ہیں۔ دروازوں پر پٹا پٹی کے پردے لٹک رہے ہیں۔ حکیم صاحب اپنے مخصوص احباب کے درمیان تشریف فرما ہیں۔ اُن کے سامنے ایک مناسب مقام پر میر صاحب جلوہ گر ہیں۔ دو تین بیدری کام کے فرشی حقے اور لمبی پیچ دار مٹک والی کلی کا دور جاری ہے۔ پان کے بیڑوں سے پُر چاندی کا ایک خاصدان، اُس کے قریب ہی اُگالدان حکیم صاحب کے پاس موجود ہے۔

میر صاحب کا چہرہ مہرہ اور حلیہ ملاحظہ ہو۔ دُبلے پتلے، درمیانہ قد، چھریرا بدن، کتابی چہرہ، خشخاشی ڈاڑھی، سر پر روئی کا کنٹوپ۔ اُس کے دونوں سرے اُلٹے ہوئے جو ٹوپی سی بن گئے ہیں۔ سیاہ زمین اور لال بوٹیوں کی چھینٹ کی کمری، سیر سوا سیر روئی کی رضائی، ٹانگوں میں خاکی زین کا پاجامہ، موٹے اُون کے موزے پاجامے کی موریوں پر چڑھے اور کسے ہوئے، شباہت میں کوئی فرق نہیں، ہاں کسی قدر جھریا گئے ہیں۔

میر صاحب، چپنیا بیگم (افیون) کے عاشق زار تھے۔ بغیر نشہ گانٹھے داستان شروع نہ کرتے لیکن انجانوں کو اُن کے افیونی ہونے کا شبہ تک نہ ہوتا۔ میر صاحب نے جیب سے ایک چاندی کی ڈبیا اور ایک چھوٹی سی پیالی نکالی پھر افیون کی ایک گولی کو روئی کے پھوئے میں لپیٹا، پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور اُس اٹنے کو اُس میں ڈبو کر چٹکی سے گھولنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں افیون گھل کر پیالی میں آگئی، روئی علٰحدہ کر کے اُگالدان میں ڈالی۔ پیالی اُٹھا کر گھولے کی ایک چسکی لگائی اس کے بعد چائے کے دو چار گھونٹ لئے اور داستان شروع ہوگئی:-

"ایک تھا دیوانہ، برسات کا زمانہ تھا، وہ اپنے کوٹھے کی چھت پر سوتا تھا کہ اُس نے خواب میں دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ کچھ بیٹھے تاش سے جی بہلا رہے ہیں، کچھ نے چوسر کی بازی جما رکھی ہے۔ کسی نے ستار چھیڑ رکھا ہے، اور کچھ لوگ کونے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں یہ اُن کے قریب گیا۔ سُنا تو کہہ رہے ہیں کہ بھئی سسرال بڑے مزے کی جگہ ہے۔

اُس نے جی میں کہا کہ ہم تو کبھی سسرال گئے نہیں۔ صبح اُٹھا۔ اپنی ماں کے پاس گیا اور کہا کہ "بی تم نے ہمیں کبھی سسرال نہیں بھیجا"۔ اُس نے کہا "بیٹا تم تو دیوانے ہو عقل مندوں کی باتیں کرو تو سسرال بھیجوں"۔ اُن نے کہا "اماں ہم تو

ڈوب مریں گے۔" اُس نے کہا "بیٹا! ناک کی سیدھ چلے جاؤ سسرال پہونچ جاؤ گے۔"

یہ چلا ناک کی سیدھ - چلا جارہا تھا کہ راستے میں آگیا کھجور کا درخت - اُس نے کہا یہ تو بہت خرابی ہوئی - خیر چڑھ گیا کھجور کے درخت پر - اب اُترنے جو لگا تو پنے تو رہ گئے ہاتھ میں، پاؤں لگے لٹکنے - اتنے میں دیکھا کہ دور سے ایک سانڈنی سوار چلا آرہا ہے۔ اُن نے آواز دی - "میاں سانڈنی سوار ذرا میرے پاؤں پکڑ لیو۔" سانڈنی سوار نے آکر اُس کے پاؤں پکڑے - پاؤں پکڑے ہی تھے کہ نیچے سے سانڈنی نکل گئی اور یہ بھی لگا لٹکنے - اتنے میں دیوانے نے دیکھا کہ دور سے ایک آدمی ٹٹو پر سوار چلا آرہا ہے - یہ چلایا - "کہ میاں گھوڑ سوار ذرا ہمارے پاؤں پکڑنا" گھوڑ سوار نے سانڈنی سوار کے پاؤں پکڑے تھے کہ ٹٹو بدک کر دور نکل گیا۔ اب میاں ٹٹو سوار بھی لگے لٹکنے - اب دیوانہ کیا دیکھتا ہے کہ دور سے ایک بڈھا ڈوم گدھے پر سوار چلا آرہا ہے دیوانے نے کہا - "بڑے میاں ہمارے پاؤں پکڑیو، نہیں تو ہم مرے۔" ڈوم بولا - "بھیا! میں بڈھا آدمی ہوں مجھ سے پاؤں کیوں پکڑواتے ہو؟" خیر تینوں نے منت سماجت کی تو بوڑھے ڈوم نے درخت کے نیچے آکر گھوڑ سوار کے پاؤں پکڑے، گھوڑ سوار کے پاؤں پکڑنا تھے کہ گدھا دولتی جھاڑ کر بھاگ کھڑا ہوا ایک سانڈنی سوار، دوسرا گھوڑ سوار، تیسرا ڈوم اُن سب کا بوجھ جو دیوانے پر پڑا تو بلبلا اُٹھا - دل بہلانے کو کچھ تو چاہیے، ڈوم سے کہنے لگا "کہ میاں کچھ سناؤ کہ دل بہلے" غرض کہ ڈوم نے گانا گایا - گھوڑ سوار نے ہاتھ سے طبلے پر تھاپ دی، سانڈنی سوار ناچنے لگا اور دیوانے نے ہاتھ بڑھا بڑھا کر داد دینی شروع کی - اب جو ہاتھ چھوٹے تو ڈوم پر گھوڑ سوار، گھوڑ سوار پر سانڈنی سوار - دیوانہ تھا سب سے اونچا گرا تو سب سے زیادہ چوٹ آئی - نکسیر جو پھوٹی تو کہا - "سسرال بڑے مزے کی جگہ ہوگی مگر راستہ بہت ٹیڑھا ہے۔"

داستان کے دوران میں سامعین گوش بر آواز محو حیرت و استعجاب رہتے، کبھی بے اختیار واہ واہ کے الفاظ منہ سے نکل جاتے داستان ختم ہوتے ہی میر صاحب فرماتے - "حضرات اب دیدہ خواہد شد، آداب عرض کرتا ہوں۔" ساری محفل بے ساختہ پکار اُٹھتی واہ! واہ! سبحان اللہ! کیا کہنا ہے - میر صاحب واقعی یہ فن آپ ہی کے دم سے اب تک زندہ ہے۔

انتخاب از کانا بانی

ایک روز شاہ جہاں بادشاہ دربار کر رہا ہے، اور مقررہ دربار ہے - اُس میں اراکین سلطنت نذریں پیش کر رہے ہیں۔ نقیب نذریں دینے والے کا نام، عہدہ اور جو شاہی اعزاز ہے اُسے کہہ کر اُس کے بعد کہتا ہے۔ کہ "آداب بجالاؤ - بادشاہ عالم پناہ سلامت!" تمام سردار اپنے اپنے اعزاز کے موافق قرینہ باقرینہ نہایت ادب سے حاضر ہیں - نقارہ دربار، جھانیا مدار گرج رہا ہے اور نوبت پر ٹکور، جھانج کو زمزمہ، سلامی کی توپوں کی گرج سے شہر گونج رہا ہے - نقیبانِ خوش گلو کی آوازیں لطف دیتی ہیں - سچ ہے بادشاہ اور نمونۂ خدائی۔

میں داستان گو ہوں، دربار کے حالات بہت کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن میں تو رسالہ پیش کر رہا ہوں - غرض سردار دکن اُس زمانہ میں قطب شاہی تھے - یہ سردار نذر پیش کر رہا ہے کہ اتفاق سے شاہجہاں کی گردن میں کھجلی اُٹھی، ناقابل برداشت - شاہ جہاں دشاہ ہے - تخت پر رونق افروز ہے - دربار کر رہا ہے - بادشاہ دربار میں خلاف ادب کوئی حرکت نہیں کرتا، اب گردن کو چار آدمیوں میں کھجاتا یا کسی سے کہتا کہ کھجا دو، یہ کون سا اخلاق ہے؟ اب بادشاہ نہ تو خود ہی کھجا سکتا ہے اور نہ کسی سے کہہ سکتا ہے کہ کھجا دو اور دوسرے کا کھجانا کارے دارد -

میرزا ثریا جاہ جو سلطنت کے چراغ کی جلائی ہوئی سی ٹیم تھی اور خاندان مغلیہ کی مٹی ہوئی سی مدھم نشانی تھی - زمانہ میں کسی شے کو قرار نہیں کہ ہر شے متغیر ہے، الا اگر قرار ہے تو تغیر کو قرار ہے - میری یاد کی بات ہے کہ صاحب عالم میرزا ثریا جاہ بیمار ہوئے اور پیچشوں نے کام سے جواب دے دیا - حکیم عبدالمجید خاں صاحب حاذق الملک بہادر نے علاج شروع کیا - میں بیس برس تک حکیم صاحب کے ہمراہ سفر حضر میں رہا ہوں - غرض صاحب عالم کے پٹھوں میں کچھ حرکت اور خون میں کچھ دور کی تحریک [illegible] ہوئی، اس کی وجہ

جسم میں سل سلاہٹ پیدا ہوئی تو صاحب عالم کے ہاتھ تو کام ہی نہ کرتے تھے، جو اس وقت حاضر ہوتا تو صاحب عالم فرما دیتے تھے کہ ذرا پیٹھ کھجا دو۔ جب صاحب عالم کچھ اچھے ہو گئے تو کسی نے صاحب عالم سے دریافت کیا۔ "حضور یہ تو فرمائیں کہ جناب کو دوران حال کیا کیا تکلیف تھی؟" تو صاحب عالم نے فرمایا کہ "اور جو تکلیفیں تھیں وہ تو تھیں ہی لیکن دو تکلیفیں ایسی تھیں کہ تمام عمر یاد رہیں گی۔ ایک تکلیف یہ کہ جب میری پیٹھ میں کھجلی اٹھتی تھی، میں تو کہتا تھا کہ نیچے کھجاتا تو وہ اوپر کھجاتا تھا اور میں کہتا کہ دائیں وہ بائیں۔ اور دوسری تکلیف جب میں روٹی کھاتا تھا تو میں تو کہتا تھا کہ چھوٹا نوالہ دے تو وہ بڑا نوالہ دیتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ بھائی سالن کم لگا تو وہ زیادہ لگاتا تھا اور زیادہ کہتا تو کم۔ افسوس ہے قدر نعمت بعد زوال ہوتی ہے، اور تکلیفوں کو تو میں کیا بیان کروں۔"

غرض سردار دکن نذر دے رہا ہے اس وقت شاہ جہاں کی گردن میں کھجلی کی شدت ہوئی۔ شاہجہاں نے ہاتھ تو نذر کی طرف بڑھایا اور گردن کو ذرا پھیرا کہ عبا کا کنارہ مس کرے گا تو کھجلی مٹ جائے گی۔ یہ خیال کر کے بادشاہ نے ذرا سا رخ پھیرا، سردار کی نظر پڑی۔ اُسنے سمجھا کہ غضب ہوا۔ شاہ نے نذر لینے میں رخ پھیرا۔ معلوم ہوا کہ اب خیر نہیں۔ اس غریب کا تو اس خیال سے رنگ زرد ہو گیا۔ سمجھا کہ کسی دراندار نے کچھ کہدیا، یا مجھ سے کوئی سخت غلطی ہوئی۔ غرض کہ بعد دربار اپنے خیمے پر آیا۔ اُس کا کیمپ جہاں اب صدر بازار ہے، یہاں تھا۔ خیمے میں آکر پلنگ پر گرا اور حواس باختہ ہوئے۔ بے ہوش ہو گیا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ کمزوری بڑھی۔ مرض لاعلاج، اب کیا کرتا۔ سعداللہ خاں شاہجہاں کے وزیر ہیں۔ سعداللہ خاں وزیر سہی لیکن اتنی مجال کہاں جو خلاف مرضی بادشاہ کے دریافت کرے کہ حضور کیوں خفا ہیں۔ اسی صورت میں تین مہینے گزر گئے۔ یہ غریب فکر میں گھلا جاتا ہے اور پڑا پڑا رنجھ رہا ہے۔

ایک روز شاہ جہاں تیسرے پہر کا وقت ہے، ثمن برج میں رونق افروز ہے، سامنے جمنا بہہ رہی ہے اور اپنے لب ساحل سے قلعہ کی پابوسی کر رہی ہے۔ وہ زمانہ! جمنا کا چڑھاؤ ہے۔ بقول شخصے مچھلی پلٹے۔ موجیں آرہی ہیں اور اب تو اس قلعے سے جمنا کا دل بھی پھٹ گیا قدم آگے سے پیچھے ہٹ گیا اور اسی غم میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ اس صورت میں جمنا کو دریا کہنا پھبتا نہیں اور یہی حالت رہی تو کون اسے دریا کہے گا۔ غرض شاہ جہاں بیٹھا ہے۔ اس وقت موسم بھی خوشگوار ہے۔ شاہ جہاں کے مزاج میں فرحت ہے کہ سعداللہ خاں حاضر ہوا۔ ضروری کاغذات پیش ہوئے۔ شاہ نے دستخط کئے۔ سعداللہ خاں نے بستہ باندھا اور بادشاہ کو خوش دیکھ کر ذرا ٹھٹکا۔ شاہجہاں تو بادشاہ ہے اور بادشاہ تمام علوم وفنون کا جاننے والا ہوتا ہے۔ سعداللہ خاں کا ٹھہرنا تھا کہ شاہجہاں سمجھ گیا۔ خبریں تو برابر گزرتی ہی رہتی ہیں کہ آج سردار دکن کا یہ حال ہے اور سعداللہ خاں کی معرفت دریافت حال چاہتا ہے کہ عالم پناہ کو میری طرف سے ایسا خیال کیوں ہے؟ شاہ جہاں نے سعداللہ خاں سے فرمایا کہ "کیا سردار دکن کے متعلق تم کو کچھ دریافت کرنا ہے؟" سعداللہ خاں نے دست بستہ عرض کی کہ "جہاں پناہ روشن ضمیر ہیں، پھر عرض کرنا بے محل۔" بادشاہ نے فرمایا کہ "نہیں اُس سے کہدو کہ کچھ ملال نہیں اُس وقت ابدولت کی گردن میں کھجلی اٹھی تھی اس وجہ سے ذرا توجہ اُس طرف ہوئی، ورنہ کوئی ملال نہیں اور اتنے عرصہ تک جو اظہار نہ فرمایا، صرف اُس کی عقیدت کا امتحان تھا۔ اچھا اُس سے کہو کہ معلوم ہوا کہ وہ عقیدت کیش ہے۔ ایک پہر تک جواہر خانۂ شاہی سے جو شے پسند آئے وہ لے جائے۔"

غرض سعداللہ خاں یہ حکم شاہی سُن کر روانہ ہوا اور سردار سے جا کر کہا۔ پس یہ سُن کر سردار دکن روانہ ہوا، جواہر خانہ میں آیا گو اُس کو بھی اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہے لیکن جواہر خانے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور جواہر پیش ہونے شروع ہوئے یہ جس شے کو پسند کرتا ہے اُس کے آدمی لے لیتے ہیں، اب ایک عرصہ کے بعد داروغۂ جواہر خانہ نے عرض کی کہ "جناب یہ کیا پسند فرمائے ہیں۔ ٹھہرئیے میں لاتا ہوں۔" یہ کہکر داروغہ اندر گیا اور ایک صندوقچہ لایا، جس کا غلاف کمخواب کا، صندوقچہ سونے کا۔ اب اس داروغہ نے صندوقچہ کھولا اور ایک جیغہ یا سرپیچ نکالا۔ جیغے اور سرپیچ میں فرق ہے۔ سرپیچ پگڑی کے اوپر چار انگل چوڑا اور گز سوا گز لمبا لپیٹا جاتا ہے اور جیغہ بھی پگڑی کے اوپر لپیٹتا ہے لیکن یہ جواہر نگار ہوتا ہے اور بیچ میں اس جیغے کے ایک کیری ہوتی ہے۔ اس جیغے کے

جواہر کا تو کیا پوچھنا ہے - صرف اس جیغے کی کیری جو نو انچ لمبی اور چار انچ چوڑی ایک پرکالۂ زمردی تھی - جس وقت بادشاہ اس جیغے کو باندھ کر ذرا سر کو خم کرتا تھا تو تمام لباس شاہی سبز ہو جاتا تھا - سردار دکن نے یہ دیکھ کر جواہر خانہ کے داروغہ سے کہا:- "او نمک حرام! رکھ اسے وہیں جہاں سے لایا ہے، یہ شے حضور کے سر مبارک پر لگانے کی ہے - اگر میں اس کو لے بھی گیا تو کہاں لگاؤں گا ہاں اگر کوئی شے پائے مبارک پر لگانے کی ہو تو لا کہ جس کو میں اپنے سر پر لگا کر فخر کروں"۔

شاہجہاں کو یہ خبر فوری پہونچی - اُس وقت شاہجہاں وضو کر رہے تھے - یہ سن کر بادشاہ مسکرائے اور حکم دیا کہ کاغذ اور قلم دوات لاؤ چنانچہ کاغذ اور قلم دوات آئی، شاہجہاں نے حکم لکھا کہ ایک پہر اور - بس اب کیا تھا، یہ سردار مالا مال ہو کر نکلا -

یہ خبر حضرت عالمگیر کو ہوئی یہ تو عالمگیر ہی تھے، تمام عالم پر قبضہ جمانا چاہتے تھے - فرمایا - غضب کیا باداجان نے دلی کو لٹوا دیا - اب دلی میں کیا دھرا ہے؟ یہ اسی نظر کی غلطی کا نتیجہ ہوا کہ دکن کی مہم درپیش ہوئی - اس لئے مناسب ہے کہ سماعت کو وسیع کر دو کہ سننے میں ہزاروں نعمتیں پوشیدہ ہیں - قدرت کی طرف متوجہ ہو کہ کان کے پردے کھلیں - قدرت کا کوئی قصور نہیں - یہ جو کچھ ہے قصور اپنا ہی ہے - قدرت کا اس میں کیا قصور ہے کہ ہم اپنے اعضاء سے کام نہ لیں اور الزام قدرت پر رکھیں - خدا تعالیٰ سے دماغ کی صحت اور اپنی صحت و تندرستی کی دُعا مانگو - قدرت کے قانون تو کچھ الگ ہی ہیں - پہلے ہم اپنے دماغ کی تندرستی اور صحت کی طرف متوجہ ہوں، پھر قدرت ہمارے ساتھ ہے، قدرت تو اہل کو کو دیتی ہے نا اہل کو نہیں -

(اُردو نامہ - کراچی)

مادرِ وطن کے فلاح و بہبود کے لئے

ہمارے اقدامات

نہایت نفیس، پایدار اور ہم وار

اونی ویونگ یارن

اور

ہینڈ نٹنگ وول

ہمارے ہاں جدید ترین طریقے سے طیار کئے جاتے ہیں -

گوکل چند رتن چند وولن ملز (پرائویٹ) لمیٹیڈ (انکارپوریٹیڈ ان بمبئی)

کوئنز روڈ امرت سر

باب الاستفسار

(۱)

حضرت عائشہ کی عُمر شادی کے وقت کیا تھی

اور

رسول اللہ نے متعدد شادیاں کیوں کیں،

عبدالسلام خاں - آگرہ)

عام طور پر کہا جاتا ہے اور غالباً بعض کتب تاریخ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کی شادی رسول اللہ کے ساتھ ۶ سال کی عمر میں ہوئی اور رخصتی ۹ سال کی عمر میں - حالانکہ رسول اللہ کی عمر اُس وقت ۵۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی - زمانۂ حال کے نقطۂ نظر سے یہ بات بڑی معیوب اور قابل اعتراض سمجھی جاتی ہے، اسی طرح رسول اللہ پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ انھوں نے متعدد شادیاں جذبۂ شہوانی کی بنا پر کیں - ازراہ کرم ان مسایل پر تفصیلی روشنی ڈالئے -

---

نگار) رسول اللہ کی ذات گرامی پر یہ اعتراض کہ آپ نے محض جذبۂ شہوانی کی بنا پر متعدد شادیاں کیں، کوئی نئی بات نہیں، لیکن افسوس ہے معترضین نے کبھی تمام حالات و واقعات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ یہ اعتراض ان کے دل میں پیدا ہی نہ ہوتا - عرب گرم ملک ہے اور وہاں مرد عورت دونوں چودہ پندرہ سال کی عمر ہی میں بالغ و جوان ہو جاتے ہیں، لیکن رسول اللہ نے پورے ۲۵ سال اپنی عمر کے نہایت پاکدامنی کے ساتھ مکہ میں گزار دئے، اس کے بعد جب آپ کی شادی جناب خدیجہ سے ہوئی تو اس وقت بھی کوئی جنسی جذبہ سامنے نہ تھا، کیونکہ جناب خدیجہ بیوہ تھیں اور ان کی عمر ۴۰ سال کی تھی، اس لئے اگر رسول اللہ کا مقصود جنسی تلذذ ہوتا تو آپ ایک معمر خاتون سے کیوں شادی کرتے جبکہ آپ کی دولت نسب و بلندی اخلاق کی بنا پر بڑے سے بڑے خاندانوں کی حسین ترین لڑکیاں آپ کو مل سکتی تھیں -

حضرت خدیجہ بیوہ تھیں اور آپ کے پہلے دو شوہر مر چکے تھے جن سے متعدد اولادیں بھی ہوئی تھیں - چونکہ آپ کا کاروبار تجارت کافی وسیع تھا آپ کو ایک دیانتدار محنتی کارکن کی ضرورت تھی اس لئے رسول اللہ کی امانت و دیانت کا شہرہ سُن کر آپ نے اس خدمت کے لئے رسول اللہ کو انتخاب کیا اور آپ نے اسے منظور کر لیا -

آپ نے یہ کام اس قدر امانت و دیانت کے ساتھ انجام دیا کہ جناب خدیجہ کو بہت نفع ہوا اور انھوں نے آپ سے شادی کی درخواست کی آپ نے اس لئے منظور کر لیا کہ کوئی دوسرا شخص کاروبار کا سنبھالنے والا موجود نہ تھا -

اس کے بعد جب شادی کو ۱۵ سال گزر گئے تو آپ کو منصب نبوت عطا ہوا اور اس سے دس سال بعد حضرت خدیجہ کا انتقال ہو گیا اس وقت

آپ کی عمر ۵۰ سال کی تھی اور پچھلی چوتھائی صدی کے عرصہ میں دوسری شادی کا تصور بھی کبھی آپ کے ذہن میں نہیں آیا اور پورے ۲۵ سال اپنی معمر رفیقۂ حیات کے ساتھ ہنسی خوشی گزار دئے، ان حالات کے تحت کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ کی پہلی شادی جذبۂ جنسی سے تعلق رکھتی تھی۔

حضرت خدیجہ کی رحلت سے چونکہ رسول اللہ کو سخت صدمہ پہونچا تھا اور آپ بہت ملول رہنے لگے تو آپ کی ایک صحابیہ نے دوسری شادی کے لئے جناب عائشہ کا نام پیش کیا۔ آپ خاموش ہوگئے اور اس خاموشی کو رضامندی سمجھ کر اس صحابیہ نے جناب عائشہ کے والد حضرت ابوبکر صدیق سے اس کا ذکر کیا، لیکن چونکہ وہ پہلے ہی ایک شخص جبیر سے منسوب ہو چکی تھیں اس لئے ضروری تھا کہ پہلے جبیر سے دریافت کرلیا جائے۔ جبیر چونکہ خود اس رشتہ کو پسند نہ کرتا تھا، اس لئے وہ راضی ہوگیا اور اس کے بعد حضرت عائشہ کا نکاح رسول اللہ سے ہوگیا۔ (حضرت عائشہ کی عمر کے متعلق ہم اخیر میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے)

چونکہ حضرت عائشہ نابالغ تھیں اور رخصتی کی رسم کئی سال کے لئے ملتوی ہوگئی تھی، اس لئے رسول اللہ نے اسی زمانہ میں جناب سودہ سے شادی کرلی۔ یہ اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئی تھیں اور جب وہاں سے لوٹیں تو راستہ میں ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا اور آپ بالکل بے یار و مددگار رہ گئیں۔ رسول اللہ نے یہ شادی بھی ایک معمر ہی خاتون سے کی، جو معمر تھیں صاحب اولاد تھیں اور صورت و شکل کے لحاظ سے بھی بہت معمولی، اس لئے یہاں بھی کوئی سوال جنسی لذت کا پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے کئی سال بعد جب جنگ بدر میں جناب حفصہ (حضرت عمر کی صاحبزادی) کے شوہر شہید ہوگئے تو رسول اللہ نے ان سے ازراہ ہمدردی نکاح کرلیا، اسی طرح جب جنگ احد میں عبداللہ ابن جحش شہید ہوگئے تو ان کی بیوہ (زینب) کو ایک سال بعد ابوسلمہ کی وفات کے بعد ان کی بیوہ ام سلمہ کو حبالۂ عقد میں لے آئے۔ آپ کی یہ تینوں بیویاں بھی وہ تھیں جو بیوہ ہو چکی تھیں اور ان سے شادی کا مقصود ان کی دلدہی کے سوا کچھ نہ تھا۔

آپ کی چھٹی شادی جناب زینب سے ہوئی جو زید کی مطلقہ بیوی تھیں۔ زید کے ساتھ جناب زینب کی شادی خود رسول اللہ کے اشارہ و اصرار سے ہوئی تھی، کیونکہ زید پہلے رسول اللہ کے آزاد شدہ غلام تھے اور رسول اللہ آقا و آزاد شدہ غلام کے درمیان نفاق کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ لیکن جب میاں بیوی میں نہ بنی اور زید نے طلاق دیدی تو خود رسول اللہ نے شادی کرلی، کیونکہ یہ شادی آپ ہی کے اصرار سے ہوئی تھی اور اس کے طلاق ہوجانے کے بعد اس کی تلافی آپ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

اسی سال جنگ بنی مصطلق میں جب متعدد جنگی قیدی ہاتھ آئے تو ان میں ایک بیوہ خاتون جویریہ بھی تھیں اور رسول اللہ نے ان سے صرف اس لئے شادی کی کہ قبیلہ بنی مصطلق سے تعلقات خوشگوار ہوجائیں۔

اس کے بعد ۷ھ میں آپ نے ام حبیبہ سے شادی کی، یہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں جو ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھیں اور وہیں ان کے شوہر عبیداللہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس شادی کا مقصود بھی یہ تھا کہ بنو امیہ سے تعلقات خوشگوار ہوجائیں۔

۷ھ میں جنگ خیبر کے وقت جب ایک یہودی سردار کی لڑکی صفیہ جنگی قیدی کی حیثیت ہاتھ آئیں، جن کے شوہر لڑائی میں ہلاک ہوچکے تھے تو رسول اللہ نے ان سے بھی شادی کرلی، تاکہ یہود سے اتحاد زیادہ مضبوط ہوجائے۔

اسی سال مقوقس شاہ حبشہ نے ایک کنیز ماریہ (قبطیہ) رسول اللہ کو بھیجی اور آپ نے شاہ حبشہ کا دل رکھنے کے لئے اس سے بھی شادی کرلی۔ اس کے بعد آپ نے میمونہ سے نکاح کیا جو آپ کی آخری بیوی تھیں۔ اس سے قبل میمونہ کا نکاح بھی دو مختلف آدمیوں سے ہوچکا تھا، ایک سے طلاق ہوگئی تھی اور دوسرے کا انتقال ہوچکا تھا۔ یہ شادی بھی رسول اللہ نے صرف اس لئے کی کہ قبیلہ رصعصہ سے تعلقات اچھے ہوجائیں۔

اس بیان سے آپ پر واضح ہوگیا ہوگا کہ رسول اللہ کی ان تمام بیویوں میں حضرت عائشہ اور ماریہ کے علاوہ سب کی سب عمر

یا بیوہ تھیں جن سے آپ نے اخلاقی فرض یا مصلحت سیاسی کی بنا پر شادی کی اور جنسی جذبہ کا کوئی سوال سامنے نہ تھا۔ کیونکہ اول تو اس جذبہ کا زمانہ تو وہی ۲۵ سال کا زمانہ تھا جو آپ نے جناب خدیجہ کے ساتھ گزار دیا، اس کے بعد آپ کا دار کہولت شروع ہوگیا اور ظاہر ہے کہ جس شخص کی جوانی اس قدر پاکیزہ گزری ہو، اس میں ۵۰ سال کی عمر کے بعد جنسی جذبہ کا ہیجان کیونکر پیدا ہو سکتا تھا۔ علاوہ اس کے یوں بھی غور کیجئے کہ اگر آپ کے پیش نظر واقعی یہی جذبہ ہوتا تو کیا آپ کو عمر رسیدہ، مطلقہ یا بیوہ خواتین کے علاوہ اور کوئی عورت نہ مل سکتی تھی جبکہ عرب میں متعدد شادیاں کرنے کا عام رواج تھا اور تمام بیویاں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت امن و سکون کی زندگی گزارنے کی عادی تھیں

رہا یہ مسئلہ کہ حضرت عائشہ کی شادی و رخصتی کس عمر میں ہوئی، یہ بھی کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں اور یہ کہنا کہ حضرت عائشہ کی عمر شادی کے وقت ۶ سال کی تھی اور ۹ سال کی عمر میں رخصتی ہوئی بالکل غلط ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ نکاح کے وقت آپ کی عمر ۱۰ سال کے قریب تھی اور رخصتی کے وقت ۱۵ سال کی ۔ میرے دلایل یہ ہیں :-

۱۔ اصابہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب فاطمہ حضرت عائشہ سے عمر میں پانچ سال بڑی تھیں اور جناب فاطمہ کی ولادت اس سال ہوئی تھی جب کعبہ کی تعمیر و مرمت از سر نو ہو رہی تھی یعنی رسول اللہ کو منصب نبوت عطا ہونے سے ۵ سال قبل۔

اس حساب سے حضرت عائشہ کی ولادت کا سال پہلا سال نبوت قرار پاتا ہے اور جب رسول اللہ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو حضرت عائشہ کی عمر ۸ سال کی تھی کیونکہ رسول اللہ نے چودھویں سال نبوت میں ہجرت کی تھی اور شادی اسکے ۵ سال بعد ہوئی۔

۲۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ۲ھ میں رخصتی ہوئی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نکاح اس سے ۵ سال پہلے دسویں سال نبوت میں ہوا جب حضرت عائشہ کی عمر ۱۰ سال کی تھی اور رخصتی اس کے ۵ سال بعد اس وقت ہوئی جب کہ ان کی عمر ۱۶ سال کی تھی۔

۳۔ حضرت عائشہ کی ایک روایت ہے کہ جب سورۂ القمر نازل ہوئی تو ان کے کھیل کود کا زمانہ تھا لیکن اس کی بعض آیتیں انھیں یاد تھیں اور وہ انھیں دُہرایا کرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اہلیت ایک بچہ میں سات آٹھ سال کی عمر سے پہلے پیدا نہیں ہوتی اور چونکہ یہ سورۃ نکاح سے کم از کم دو سال پہلے نازل ہوئی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ نکاح کے وقت آپ کی عمر کسی طرح ۱۰ سال سے کم نہ رہی ہوگی اور رخصتی ۱۶ سال کی عمر میں ہوئی اور یہ وہ عمر ہے جب عرب کی لڑکیاں پوری طرح جوان و بالغ ہو جاتی ہیں۔

---

(۲)
حروف تہجی

(محمد اسلم خاں - سہارنپور)

"اُردو کے حروف تہجی خود با معنی ہوں یا نہ ہوں، لیکن ان کے بعض حروف ایسے ہیں جو دوسرے لفظ سے مل کر مفہوم کو بدل دیتے ہیں جیسے سنسکرت یا ہندی میں آ الف کسی لفظ کے پہلے لانے سے نفی کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہٹ سے اہٹ انگریزی میں حرف "A" بھی گاہ گاہ یہی کام دیتا ہے جیسے drift سے Adrift اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انگریزی و ہندی آ یا A نفی کے معنی پیدا کر دیتے ہیں۔

میں جاننا چاہتا ہوں کہ عربی فارسی میں حروف تہجی کے الحاق یا ایزاد سے لفظ کا مفہوم بدل جاتا ہے یا نہیں اور اس کی نوعیت کیا ہے۔

(نگار) آپ کا استفسار بہت دلچسپ ہے، لیکن اسی کے ساتھ بڑا تفصیل طلب۔ حروف تہجی بصورت تحریر تو بے معنی نقوش ہیں

لیکن بہ صورت تلفظ بامعنی ہیں۔ یعنی " ا " کے تو کوئی معنی نہیں لیکن جب آپ اسے الف کہیں گے تو یہ ایک بامعنی لفظ ہو جائے گا۔ یہی حال تمام حروف تہجی کا ہے، لیکن اس کی صراحت و تفصیل کا موقع نہیں اور نہ یہ گفتگو آپ کے استفسار سے متعلق ہے۔

آپ نے صرف حرف " ا " (الف) کے متعلق سوال کیا ہے، اس لئے فی الحال اس کا ذکر مناسب ہے ہندی اور انگریزی میں " ا " اور " A " کا الحاق بے شک نفی کا مفہوم پیدا کر دیتا ہے، لیکن عربی و فارسی میں اس کا استعمال نفی کے معنی پیدا نہیں کرتا عربی میں الف کا الحاق استفہام اور نداو قریب کے معنی پیدا کر دیتا ہے جیسے " کَتَبْتَ " کے معنی ہیں " تو نے لکھا " لیکن اکتبت کے معنی ہو جائیں گے " کیا تو نے لکھا " اسی طرح جب ہم کسی کو پکاریں گے یا مخاطب کریں گے تو اس کے نام سے پہلے آ بڑھا دیں گے، جیسے " اَزیدُ اقبل " اے زید ادھر آ۔

لیکن فارسی میں نہ صرف الف بلکہ تمام حروف کا اضافہ خواہ وہ شروع میں ہو یا اخیر یا درمیان میں معنی بدل دیتا ہے اور یہ خصوصیت کسی زبان میں نہیں پائی جاتی مثلاً الف ہی کو لیجئے کہ اس کے اضافے سے کتنے مختلف معانی پیدا ہو جاتے ہیں :-

۱ - خداوند سے خداوندا، (بہ معنی اے خداوند)

۲ - مفہوم دُعا کے لئے الف درمیان لفظ میں بڑھاتے ہیں، جیسے :- دہد سے دہاد - خداش خیر دہاد۔

۳ - بہ معنی زیادتی، کثرت و تکرار جیسے گوناگوں - لبالب۔

۴ - عطف کے لئے بہ جیسے شبا روز (بہ معنی شب و روز)

۵ - خاعلی معنی :- جیسے داتا، بینا۔

۶ - حصر و احاطہ :- جیسے سراپا (بہ معنی از سر تا پا)

۷ - لیاقت و مفعولی معنی پیدا کرنے کے لئے : جیسے پزیر سے پزیرا ——— (وہ بات جو قابل قبول ہو)

۸ - تحسین یا تذلیل : جیسے خوشا - بدا۔

بدا سلطانیا کو را بود رنج دل آشعربی خوشا درویشیا کو را بود عیش تن آسانی

۹ - زینت کلام : جیسے گفت سے گفتا

یار گفتا بر رخِ ماہم نگر

۱۰ - تعظیم یا تصغیر :- فردوسی کا شعر ہے :-

پیچیدہ بر خویشتن بیزنا کہ چوں رزم آرد برہنہ تنا

۱۱ - حسرت و مصیبت :- جیسے دردا، دریغا =

دریغا آبروئے دیر گر غالب مسلماں شد

۱۲ - قسمیہ - جیسے حقّا - سعدی کا مشہور مصرع ہے :-

حقا کہ باعقوبت دوزخ برابراست

۱۳ - خطاب - جیسے گوئی سے گوئیا

---

(۳)

قدح ، کاسہ ، جام ، پیالہ

(محمد مبین - رسالپور) - ازراہ کرم مطلع فرمائیے کہ قدح، کاسہ، جام و پیالہ کا مفہوم ایک ہی ہے یا ان میں کوئی فرق ہے۔

(نگار) قدح عربی لفظ ہے جس کے معنی ظرف، شراب کے ہیں (خواہ وہ ظرف چھوٹا ہو یا بڑا) لیکن یہ لفظ اسی وقت استعمال ہوگا جب وہ شراب سے خالی ہو۔

کاسہ (فارسی ہے)، عربی میں اس کو کاس کہتے ہیں جس کی جمع کؤوس ہے۔ اس سے مراد وہ ظرف شراب ہے جس میں شراب بھری ہو، یعنی خالی ظرف کو قدح کہیں گے اور شراب سے بھرے ہوئے ظرف کو کاسہ یا کاس۔ لیکن فارسی میں کاسہ و قدح خالی اور بھرے دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ اسی طرح جام اور پیالہ کا بھی ایک ہی مفہوم ہے خواہ وہ لبریز شراب ہو یا خالی۔

۲- کلیسا، کنیسہ۔ لفظ کلیساء بہ معنی معبد نصاریٰ فارسی عربی میں مستعمل نہیں۔ اس کی جگہ کنشہ اور کنیس یہود و نصاریٰ دونوں کی عبادتگاہوں کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

کلیسا اُردو میں زیادہ تر معبد نصاریٰ کے لئے بولا جاتا ہے جسے گرجا بھی کہتے ہیں۔

۳- روح القدس۔ نصاریٰ کی مذہبی اصطلاح ہے اور اقانیم ثلثہ میں سے ایک اقنوم کا نام روح القدس ہے۔ اقنوم کے معنی اصل کے ہیں اور اقانیم ثلاثہ (یعنی تین اصلوں) میں ان کے نزدیک ایک اقنوم خدا ہے، دوسرا خدا کا بیٹا (مسیح) اور تیسرا روح خداوندی (روح القدس) اسلامی لٹریچر میں روح القدس، جبرئیل (فرشتہ) کو کہتے ہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ تک وحی الٰہی پہونچاتا تھا۔ غالب کے اس شعر میں بظاہر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ جب روح القدس غالب کا ہمزبان نہیں تھا تو وہ غالب کو کیا داد دیتا ہوگا۔ واد تو اسی وقت دیجا سکتی ہے جب کسی کلام کا مفہوم سمجھ میں آجائے۔ لیکن غالب در اصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ جبرئیل میرے کلام کو نہیں سمجھ سکتا تو نہ سمجھے لیکن وحی والہام کے انداز سے واقف ہونے کی بنا پر وہ جانتا ہے کہ غالب کا کلام بھی کچھ اسی انداز کا ہے۔ داد پانے کا مفہوم یہ نہیں کہ جبرئیل سے مشاعرہ کی سی داد ملتی تھی بلکہ مقصود اس سے اس کا ذہنی اعتراف ہے اس امر کا کہ میرا کلام یکسر وحی والہام ہے اور اسی خیال کو اس نے ایک خاص انداز بیان سے پیش کر دیا۔

---

(۴)

تان سین

(۱- احمد - گلبرگہ)

مہربانی فرماکر یہ بتائیں کہ "میاں تان سین" اور تان سین ایک ہی شخصیت ہے یا دو۔ ہندوؤں نے تان سین کو ہندو ظاہر کیا ہے۔ لیکن "ادارۂ مطبوعات پاکستان" نے ایک کتاب "ہماری موسیقی" کے نام کی شایع کی تھی اور اُس میں تان سین کو مسلمان ظاہر کیا تھا۔ اسی طرح "ماہ نو"، کراچی کے ایک جمہوریت نمبر مارچ ۱۹۵۵ء میں شاہد احمد دہلوی کا ایک مضمون "تجدید موسیقی" شایع ہوا تھا اور اس مضمون میں اُنھوں نے تان سین کو مسلم ظاہر کیا ہے۔

آپ اپنے رسالہ "نگار" کی کسی اشاعت سے اُن کے (تان سین کے) مذہب کے بارے میں صحیح معلومات کے ساتھ جواب دیں۔

(نگار) تان سین اور میاں تان سین دونوں ایک ہی ہیں۔

تان سین کا نام تارکیشور پانڈے تھا اور بچپن میں انھیں لوگ تنو کہا کرتے تھے۔ موضع بیہٹ (گوالیار) میں یہ پیدا ہوئے تھے۔ انکے باپ کا نام مکرنڈ پانڈے تھا یہ اونچی ذات کے گوڑ برہمن تھے۔

گوالیار کے راجہ مان سنگھ نے جو خود بھی سنگیت کا بڑا ماہر و شایق تھا، گوالیار میں ایک سنگیت اکاڈیمی قایم کی تھی اور وہیں تان سین کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد سوامی ہری داس بندرابنی سے اس فن کی تکمیل کی اور راجہ رام چند بگھیلا فرمانروائے پتاو کالنجر کے دربار سے متوسل ہوگئے۔ جب اکبر کو ان کی مہارت فن کا حال معلوم ہوا تو ۱۵۶۲ء میں راجہ رام چند کو کہلا بھیجا کہ تان سین کو آگرہ بھیجدیا جائے۔

اکبر، تان سین کی سنگیت سے اتنا متاثر ہوا کہ پہلی ہی بار ۲ لاکھ روپیہ بطور انعام دیدئے۔ تان سین نے بہت سے گانے (دھرپد) اکبر کے نام سے بنائے جن میں نعت و منقبت کے مضامین پائے جاتے ہیں۔

تار ترنگ خاں اور بلاس خاں ان کے دو بیٹے مسلمان بیوی سے تھے اور ایک بیٹا صورت سین ہندو بیوی سے۔

آئین اکبری اور توزک جہانگیری میں نہ کہیں ان کے نام کی صراحت پائی جاتی ہے نہ مذہب کی۔ لیکن چونکہ یہ شاہ محمد غوث گوالیاری کے مرید یا چیلے تھے اس لئے انھوں نے بھی مذہب اسلام اختیار کر لیا ہوگا، لیکن بالکل وہی اسلام جو صوفیہ کا ہے اور جس کا تعلق محض انسانیت پرستی اور ہمہ اوست سے ہے۔

ریوا دربار کے کتب خانہ میں ایک مخطوطہ ہے جس میں تان سین کی تمام تصانیف محفوظ ہیں۔ اس کا جو انتخاب ڈاکٹر سر جورشاد الگوال نے اپنی کتاب "اکبری دربار کے کوی" میں دیا ہے اُس کو اگر تان سین کی تخلیق مان لیا جائے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عقیدہ "ہمہ اوست" کے قایل تھے۔

عطیہ فیضی نے اپنی کتاب بھارتی سنگیت میں لفظ تانسین کی تشریح یوں کی ہے کہ سین کے معنی سنسکرت میں نہائے ہوئے کے ہیں اس لئے تان سین کے معنے ہوئے "تان میں نہایا ہوا"۔

ہندوستان میں بارھویں صدی عیسوی کے بعد مسلمان گویندوں کی دو قسمیں ملتی ہیں۔ ایک قوال دوسرے کلاونت۔ یہ دونوں فرقے امیر خسرو کی شاگردی کا دم بھرتے تھے اور اُنھیں کے عہد سے ان کی گائکی کا چرچا شروع ہوتا ہے۔ قول و قلبانہ گانے والے قوال کہلائے اور نقش و گل میں دیسی دھنیں ملاکر یا بقول پروفیسر گوسوامی قوالی کی طرز میں روزمرہ کی چیزیں (Folk songs) گانے والے کلاونت کہلائے۔

ابوالفضل اور جہانگیر نے تان سین کو کلاونت ہی کہا ہے۔ ابوالفضل نے فتحپور سیکری پہونچنے سے پہلے بھی اُسے "یکے از کلاونتان گوالیار" لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبری دربار میں داخل ہونے سے پہلے بھی ان کو کلاونت کہا جاتا تھا۔

ان کے سن پیدائش کی صحیح تعیین مشکل ہے لیکن قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ جب ۱۵۶۲ء میں وہ اکبر کے پاس گئے تو ان کی عمر ۴۰ سال کے قریب ہوگی اسلئے وہ ۱۵۵۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے، کیونکہ دس گیارہ سال تک گوالیار میں تعلیم پانے کے بعد وہ ہندرابن سوامی ہری داس کے پاس چلے گئے تھے اور کم از کم بیس بائیس سال تک تکمیل فن میں مصروف رہے۔

خاص رعایت

پاکستان نمبر۔ علوم اسلامی نمبر۔ فرمانروایان اسلام نمبر۔ غالب نمبر۔ افشاء لطیف (نیاز) نمبر۔ مومن نمبر۔ افسانہ نمبر مجموعی قیمت علاوہ محصول ۱۳ روپیہ ہے لیکن یہ تمام نمبر ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول ۲۶ روپیہ میں ملسکتے ہیں بشرطیکہ قیمت پیشگی بھیجدیجائے۔

من و یزداں کامل ۔ مذہب ۔ فلسفۂ مذہب کی مجموعی قیمت علاوہ محصول ۱۸ روپیہ ہے لیکن ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول ۱۶ روپیہ میں مل سکتی ہیں ۔ قیمت پیشگی آنا ضروری ہے۔

جمالستان ۔ نگارستان ۔ مکتوبات کلان۔ حسن کی عیاریاں ۔ شہاب کی سرگزشت ۔ مجموعی قیمت علاوہ محصول ۲۶ روپیہ ہے لیکن ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول صرف ۲۳ روپیہ میں مل سکتی ہیں۔ قیمت پیشگی ۔ منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلہ والمناظرہ

میرزا غلام احمد صاحب
اور
تحریک احمدیت

(غلام محمد شاہ کشمیری (ام اے، ال ال بی فائنل) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مکرمی قبلہ نیاز صاحب

سلام مسنون!

(۱) میں دس سال سے "نگار" کا باقاعدہ مطالعہ کر رہا ہوں، اور ہر ماہ اس کا بے چینی سے انتظار کرتا ہوں۔ آپ جس بے باکی سے اپنی بات کہتے ہیں اور جس ہمت سے اسے پیش کرتے ہیں وہ قابل تعریف ہے، خواہ وہ رائے غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن آپ جسے درست خیال کرتے ہیں اس کا اظہار برملا کرتے ہیں۔

جن دنوں میرا رجحان کمیونزم کی طرف تھا، میں "نگار" کے ایک ایک لفظ سے متفق تھا۔ لیکن روحانی بے چینی، اور ذہنی انتشار کمیونزم کی لازمی پیداوار ہے، اسی انتشار نے آہستہ آہستہ میرا روحانی سکون سلب کر لیا تھا اور میں پھر حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ انہی دنوں میں احمدی جماعت سے میری دلچسپی بڑھنے لگی، ایک احمدی صاحب سے کتابیں ملتی رہیں جو ایک "صحابۂ مرزا صاحب" کے فرزند ارجمند تھے۔ میں شوق و ذوق سے مطالعہ میں غرق ہو گیا۔ لیکن میری رہنمائی اسی دوست کے گھریلو ماحول نے کی، سب بیٹے باپ سے الگ، جس باپ کو فخر تھا کہ اس نے میرزا صاحب کو دیکھا ہے اور جس کے لئے اب رضی اللہ عنہ لکھا جاتا ہے، اسی باپ کو یہ احمدی بیٹے طرح طرح کے تکالیف پہونچاتے رہے۔ اس نے میرے ذہنی انتشار کو اور بھی بڑھا دیا۔ اور میں نے بہائی تحریک کی طرف رجوع کیا، لیکن معلوم ہوا کہ یہاں اس جماعت میں صرف وہ احمدی ہیں جو احمدیت چھوڑ کر بہائی بن گئے ہیں۔ اس احمدیت کے دوسری اسٹیج سے خدا خدا کر کے میں بچ کے نکل گیا۔

(نگار) حیرت ہے کہ احمدی جماعت کے صرف چند افراد کے اخلاق کو دیکھ کر آپ میں ذہنی انتشار پیدا ہو گیا۔ احمدی جماعت فرشتوں کی جماعت نہیں کہ اس کے تمام افراد معصوم و بے گناہ ہوں اگر بعض افراد کسی جماعت کے بد اخلاق ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ساری جماعت اور اس کی تعلیم ہی کو ناقص قرار دیا جائے، کیا عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں منافق نہ پائے جاتے تھے اور کیا آپ حقیقت کے پیش نظر عہد سعادت کی تعلیم کو بھی تعلیم احمدیت کی طرح ناقص قرار دیں گے؟

(۲) اسلام جو قرونِ اولیٰ میں ایک سادہ، پاکیزہ، متحرک اور ہمہ مذہب تھا، بعد کے ادوار میں صوفیوں، ایجاد پسندوں اور ملاؤں کا شکار ہوتے ہوتے تفاسیر اور عجائبات کا پلندہ ہو کر رہ گیا، قرونِ اولیٰ میں اگر نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کو عملاً قایم کیا جاتا تھا، تو دلوں محبت و رافت کی شمع بھی روشن رہی تھی۔ لیکن اس کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ حج اور اسلام کی سیاسی اسپرٹ کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے کہا گیا کہ خدا کے بندوں سے صرف ہمدردی رکھنا ہی اسلام ہے اور آخر کار صوفی لوگوں نے ترکِ دنیا کا نام ہی عبادت رکھا، اور اس مہلک نظریہ کو 'طریقت' کا خوش نما لباس پہنا دیا۔

میرے نزدیک اسلام ایک سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی دستور ہے۔ جو نوعِ انسانی کو صرف ایک اللہ کی بندگی طرف بلاتا ہے اور سیاسی و سماجی طور پر وہ ایسی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے جو سراسر پاکیزہ، سادہ، متحرک اور ہمہ ہو، انسانی رواداری کا عملی نمونہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام اس سوسائٹی کے افراد کو روحانی تربیت بھی دینا چاہتا ہے۔ نوعِ انسان سے محبت کرنا، اور ہمدردی کرنا بھی سکھاتا ہے۔ متحرک اور well disciplined بھی بنانا چاہتا ہے۔ اور ان تمام چیزوں کو ایک مرکزی حیثیت دینا چاہتا ہے، اس کے لئے اسلامی دستور (قرآن) میں عبادات کے مختصر مگر جامع ہدایات بھی صاف الفاظ میں بیان کر دئے گئے ہیں۔

خشک تصوف، آستانے، سجادے، زیارت گاہیں درویشوں قلندروں اور فقیروں کی، دانوں والی لمبی تسبیحیں سقرے، مناقبہ قصیدہ خوانی، 'طریقت، حقیقت اور فنا کی تین صورتیں، ذہنی بحران اور روحانی انتشار کی منزلیں ہیں۔ فراریت، جہالت، اوہام اندھی تقلید انہی چیزوں کا نتیجہ ہیں۔ اور امام مہدی کے ظہور کا تخیل ان تمام جہالتوں کی انتہا ہے۔

(نگار) آپ کا فرمانا بالکل درست ہے، لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ بالکل وہی ہے جو احمدی جماعت کہتی ہے اور وہ غالباً آپ سے زیادہ اس نام نہاد تصوف کی مخالف ہے۔

---

(۳) ظہور مہدی کی کوئی بھی تاویل ہو، بیسویں صدی کے انسان کے دماغ کے لئے قابلِ قبول نہیں، یہ صرف ذہنی انتشار کا نتیجہ ہے جس کی عملی صورت دینے کے لئے اموی اور عباسی حکمرانوں اور بعد کے مسلمان بادشاہوں نے ملاؤں کے ذریعہ حدیثیں وضع کرائیں اور اسی نے خارجیت کو شیعیت میں تبدیل کر دیا۔ اور اسی نے بہاء اللہ کو بارھواں امام بنا دیا اور اسی نے میرزا غلام احمد کو مجدد، مسیح، ظلی محمد، مہدی بنا دیا۔ اور اسی کے دم سے آج بھی 'چن بشیشور' زندہ ہیں۔

(نگار) ظہور مہدی کے باب میں، میرا خیال بھی وہی ہے جو آپ کا ہے، لیکن غیر احمدی مذہبی علماء بھی ظہور مہدی کی روایات کے قایل ہیں، اس لئے وہ میرزا غلام احمد کی مہدویت سے اس بنا پر انکار نہیں کر سکتے کہ ظہور مہدی کی روایات غلط ہیں، پھر چونکہ میرزا صاحب بھی ظہور مہدی کی پیش گوئی کو صحیح سمجھتے تھے اور اسی کے پیشِ نظر آپ نے دعوائے تہدویت کیا، اس لئے سوال یہ نہیں پیدا ہوتا کہ وہ واقعی مہدی موعود تھے یا نہیں بلکہ صرف یہ کہ وہ اپنے آپ کو واقعی ایسا سمجھتے تھے یا انھوں نے (یہ جانتے ہوئے کہ وہ واقعی مہدی موعود نہیں ہیں) _____ مہدویت کا جھوٹا دعوے کیا۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیں کہ وہ واقعی اپنے آپ کو مہدی موعود نہیں سمجھتے تھے بلکہ روایات سے ناجائز فایدہ اٹھا کر انھوں نے لوگوں کو صرف دھوکا دینے کے لئے یہ دعویٰ کیا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بڑے مکار انسان تھے اور مکر و فریب کا جال انھوں نے محض ذاتی و دنیاوی اغراض کے حصول کے لئے پھیلایا تھا۔

دیکھئے یہی وہ نازک مقام ہے جہاں سے میری آپ کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ آپ چونکہ ظہور مہدی کی روایات کو غلط سمجھتے ہیں

اس لئے میرزا صاحب کے دعوائے مہدویت کو سُن کر فوراً حکم لگا دیتے ہیں کہ انھوں نے مکر و فریب سے کام لیا، اور میں باوجود ان روایات کو غلط سمجھنے کے میرزا صاحب کو کذب و دروغ کا مرتکب قرار نہیں دیتا، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ممکن ہے وہ اپنے آپ کو واقعی مہدی موعود سمجھتے ہوں اور اسی یقین کی بنا پر انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہو۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک غلط بات کو صحیح سمجھا، نہ یہ کہ غلط بات کو غلط جان کر اس کی صحت کا دعوے کیا۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

اب آیئے ایک دوسرے زاویہ سے اس مسئلہ پر غور کریں ــــ جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا اگر آپ کا یہ الزام صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ میرزا صاحب کا دعوائے مہدویت سراسر مکر و فریب تھا تو لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ یہ بہت بڑا مکر و فریب تھا اور جو شخص اپنے مشن کی بنیاد ہی ایسے کذب و دروغ پر قائم کرے گا، وہ یقیناً بڑے پست اخلاق کا انسان ہوگا، اور اس کی زندگی کا مقصود اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ وہ لوگوں کو دھوکا دے دیکر دُنیا کمائے اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرے ــ حالانکہ میرزا صاحب کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جسے تاویل بعید کے بھی یہ ثابت ہو سکے کہ وہ خود غرض، مطلب پرست اور طامع انسان تھے۔ انھوں نے جس وقت احمدیت کی تبلیغ شروع کی اسی وقت صاف صاف کہدیا کہ ان کا مقصود اس تحریک سے صرف عملی تعلیمات اسلام کو زندہ کرنا ہے اور اس مقصود کی تکمیل میں رات دن منہمک رہے۔ آپ کو غالباً اس سے انکار نہ ہوگا کہ اس تحریک کے سلسلہ میں انھیں کن کن مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ کیسے کیسے خار زاروں سے گزرنا پڑا، لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری اور آخر کار ان کا جذبۂ خلوص و صداقت کامیاب ہو کر رہا۔

مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ لوگ میرزا صاحب کو بُرا کہتے ہیں صرف اس بنا پر کہ انھوں نے مہدی موعود، مثیل مسیح اور ظل نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور کبھی اس کا اعتراف نہیں کرتے کہ انھوں نے مسلمانوں میں کیسی زبردست باعمل جماعت پیدا کر دی۔

---

(۴) نگار نمبر دسمبر ۵۷ء میں آپ نے احمدی جماعت کے بارے میں اپنے خیالات اظہار فرمائے ہیں۔ جہاں تک سید نصیر حسین صاحب کے خط کا تعلق ہے، وہ اخلاق کی حدوں سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ لیکن شیخ عبداللہ صاحب نے "چمن" کی باشندگی کا ثبوت دیتے ہوئے جو "گل افشانیاں" کی ہیں وہ آپ نے جس طرح قبول کر لی ہیں، اس کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا ــــ آپ کی وسعت قلبی قابل ستائش ہے

تنقیح اسلام نمبر ۵۸ء میں آپ نے اسلام کے عقاید کو جس انداز میں پیش کیا ہے اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اسلام کو ہمہ گیر تعلیم سمجھتے ہیں، لیکن جب " اسلامی اطوار و کردار اور حرکت و عمل " کا آپ احمدی جماعت کے حق میں ذکر کر رہے ہیں۔ وہاں آپ کھلی چٹھی دیتے ہیں۔ اگر آپ کے وہ خیالات جو عبادات اسلام کے بارے میں ہیں، صحیح مان لئے جائیں، تو پھر اسلام تصوف کا پلندہ اور صوفیائے خشک کا مذہب بن کر رہ جاتا ہے اور میرے خیال میں یہی چیز ہے جو آپ کو احمدی جماعت کی طرف کشش کرتی ہے۔

(نگار) آپ کا یہ ارشاد بالکل میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے تنقیح اسلام نمبر میں صرف ایک ہی چیز کو ظاہر کیا ہے اور وہ یہ کہ اسلام کیسر عملی مذہب تھا اور محض ذہنی معتقدات پر اس کی بنیاد قایم نہ تھی۔ یہی بات میں نے احمدی جماعت کی بابت بھی ظاہر کی ہے کہ اس وقت تمام مسلم جماعتوں میں وہی ایک جماعت ایسی ہے جسے ہم صحیح معنی میں باعمل کہہ سکتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس میں تصوف کی کونسی بات آپ کے نظر آئی، میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل تصوف کے منافی ہے: کہ بقول آپ کے "تصوف کا پلندہ!"

---

(۵) احمدیت، تصوف جامد کی ترقی پسند، مگر جاہلانہ شکل ہے۔ اگر یہ صرف تصوف کی تحریک ہوتی تو بہت کامیاب ہو جاتی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کی سب سے بڑی خامیاں یہ ہیں کہ اس نے انسانی سوسائٹی کو اسلامی سیاست اور ہمہ گیریت سے بیگانہ

اور بے نیاز کر دیا۔ اس نے اسلام کی مجاہدانہ حرارت کو "عدم تشدد" کا برگ حشیش پلا دیا۔ اور تیز و دور رس نظروں کو خمار آلودہ بنا کر ذہنوں پر جمود مسلط کر دیا اور اللہ کی خلافت الارض کو اد لوکل بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک پیری مریدی کے فرسودہ طریقہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہے میرزا صاحب کا مجدد سے مسیح ناصری، مہدئ موعود اور ظلی محمد بن جاتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کیا ظاہر کرتے رہے، یہ کوئی معقول جواب اور جواز نہیں ہے۔ انسانی دماغ ہر شئے سے اثر حاصل کرتا ہے۔ یہ نفسیاتی تقاضا ہے کہ ہم کسی شخص کی بات کو جانچنے سے پہلے اس کی سیرت، اقوال اس کے اٹھنے بیٹھنے، طرز معاشرت، ایفائے عہد اور لوگوں سے اس کے معاملات کو دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص پہلے ایک بات کہکر اس کی تردید ببانگ دہل کرلے، لیکن پھر وہی بات کہدے، تو وہ کس صورت میں 'صدیق' مانا جائے گا۔

(نگار۔) حیرت ہے کہ ایک طرف آپ احمدیت کو تصوف جامد بھی کہتے ہیں اور دوسری طرف ترقی پسند بھی، پھر اسی کے ساتھ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر وہ صرف تصوف کی تحریک ہوتی تو کامیاب ہو جاتی۔ آگے چل کر یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ یہ تحریک پیری مریدی کے فرسودہ طریقہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ آپ کی اس جامع انسداد تحریر سے آپ کی ذہنی تشویش تو ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ دراصل کہنا کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے روداد میں اس پر عدم تشدد کی "حشیش" پلا دینے کا بھی الزام عاید کیا ہے اور خلافۃ اللہ کو لوکل بنا دینے کا بھی، لیکن اس کی کوئی معقول دلیل پیش نہیں کرتے اور آپ صرف میرزا صاحب کے دعوائے مہدویت کو اس کی اصل وجہ قرار دیتے ہیں۔ درانحالیکہ سچ پوچھئے تو ان کے اس دعوے نے اس تحریک میں جان ڈالی اور اگر یہ کوئی نفسیاتی تدبیر تھی تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ میرزا صاحب بڑے زبردست ماہر نفسیات بھی تھے۔

اخیر میں آپ نے ایک بڑی معقول بات لکھی ہے کہ کسی شخص کی بات کو جانچنے کے لئے اس کی سیرت اس کے اقوال و افعال اور لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات کو بھی دیکھنا چاہئے۔ میں بھی بفظ بہ لفظ اسی اصول کا پابند ہوں، لیکن فرق یہ ہے کہ آپ اس اصول کے پیش نظر میرزا صاحب کے کردار کا مطالعہ کئے بغیر ان کو مورد الزام قرار دیتے ہیں اور میں ان کے اخلاق کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی عظمت کا اعتراف کرتا ہوں۔ اگر آپ تکلیف فرما کر کچھ مثالیں ایسی بھی پیش کر دیتے جن سے میرزا صاحب کی سیرت کا داغدار ہونا ثابت ہو سکتا ہے، تو میں یقیناً آپ کا ہمنوا ہو جاتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان کے حالات زندگی میں کوئی بات ایسی ملی ہی نہیں، ورنہ آپ یقیناً اسے بڑے زور و شور کے ساتھ ظاہر کر دیتے۔ محض مہدی موعود یا مثیل مسیح ہونے کا دعویٰ کرنا تو کوئی خرابی کردار نہیں۔ جب تک آپ یہ ثابت نہ کریں کہ یہ دعویٰ کر کے وہ فلاں فلاں اخلاقی معصیتوں میں مبتلا ہوئے۔

---

(۶) میرزا صاحب نے "تاریخی" حالات سے فایدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے بہت سے اصولوں کو مسخ کر دیا۔ میں جہاد کو اندھا دھند جنگ یا لوٹ مار نہیں سمجھتا ہوں۔ جایز حالات میں اگر مسلمان اپنے بچاؤ کے لئے اور اللہ کے دین کی حفاظت کے لئے تلوار نہ اٹھائے، تو یہ اس کے کیرکٹر کی انتہائی پستی ہے۔ اور اگر مسلمان قرآنی دستور کو سوسائٹی کے تمام افراد پر اور تمام شعبہ ہائے حیات میں نافذ کرنے کی کوشش نہ کرے اور اس کے علی الرغم اس سے فرار ہونے کے لئے جواز ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائے تو قرآن اور رسول پر اس سے زیادہ ظلم کیا ہو سکتا ہے، لیکن میرزا صاحب کے ہاں اسلام کے بہت سے ایسے ہی اصول یکسر نظر انداز کر دیئے گئے ہیں اور کئی اصولوں کی اس طرح غلط ترجمانی کی گئی ہے کہ خود قرآن کی روح بھی مضطرب ہو چکی ہو گی۔ آپ کا یہ ارشاد کہ احمدی جماعت اسلام کو عملاً قایم کر رہی ہے اور اس کو اپنے اطوار و کردار اور حرکت و عمل سے ثابت کر رہی ہے۔ اس بارے میں

عرض ہے کہ آپ نے صرف ان کی (ماڈرن تھیوری) کو دیکھ کر ایسی بات کہدی ہے۔ عامۃ المسلمین سے یہ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں۔ تو وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ وہ بھی توہمات میں پھنسے ہیں اور یہ بھی۔ اب رہا ان کا محبت و رافت اور جماعتی بھائی چارہ کا ڈھکوسلہ سو خود ان کی جماعت میرزا صاحب کی آنکھیں بند کرتے ہی اختلاف کا شکار ہو گئی۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کی اتنی گند اُچھالی ہے کہ شیطان بھی کوسوں دور بھاگتا ہے۔

(نگار) اس سے زیادہ غلط بیانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ میرزا صاحب پر بہت سے اصول اسلام مسخ کر دینے کا الزام قایم کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ خود اصول اسلام سے واقف نہیں۔ اعتقادی حیثیت سے اسلام نام ہے صرف اللہ رسل، کتب الہامی، ملائکہ اور بعثت بعد الموت پر ایمان لانے کا اور عملی حیثیت سے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔ سو مجھے بتایئے کہ میرزا صاحب نے ان میں کن کن باتوں کو مسخ کیا ہے وہ نظریاتی حیثیت سے ان تمام باتوں کے اسی طرح قایل ہیں جس طرح عامۃ المسلمین۔ رہی عملی حیثیت سو غالباً آپ کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں کوئی جماعت احکام اسلامی کی اتنی پابند نہیں جتنی احمدی جماعت۔ رہا مسئلۂ جہاد سو اس باب میں بھی انکا مسلک عین تعلیم قرآنی کے موافق ہے ــــ جہاد ہمیشہ اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے، ..... اور وہ جہاد جس کا مفہوم عام طور پر جنگ کہا جاتا ہے وہ بھی صرف دفاعی معنی میں فرض ہے۔ قرآن نے جارحانہ جنگ کو کبھی جایز نہیں سمجھا اور اگر آپ عہد نبوی اور عہد خلافت کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو کوئی مثال جارحانہ جنگ کی نہ ملے گی خود رسول اللہ نے بھی کبھی اشاعت اسلام کے لئے تلوار نہیں اُٹھائی اور نہ خلفاء راشدین نے ملک گیری کے لئے کسی قوم پر حملہ کیا۔ آپ عہد خلفاء کے بعد کا زمانہ سامنے نہ رکھئے۔ وہ زمانہ حکومت اسلام کا تھا، مذہب اسلام کے اقتدار کا نہ تھا۔

میرزا صاحب نے اگر انگریزوں کے خلاف جہاد بالسیف کی ممانعت کی تو وہ عین شریعت اسلامی کے مطابق تھی، کیونکہ انگریزوں کے زمانہ میں تمام مسلمان اپنے مذہبی شعائر اختیار کرنے کے لئے آزاد تھے اور ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر اس کے خلاف جہاد کرنے کی کوئی وجہ جواز موجود نہ تھی۔

اُس عہد میں اگر کوئی جہاد ہو سکتا تھا تو وہ صرف تبلیغ حق و صداقت کا جہاد تھا اور اس سلسلہ میں میرزا صاحب نے جس طرح غیر مسلموں کا مقابلہ کیا ہے اس سے آپ بھی انکار نہیں کر سکتے۔

افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں آپ نے تفصیل کے ساتھ نہیں بتایا کہ میرزا صاحب نے اسلام کے کن اصول کو نظر انداز کر دیا، کن اصول کی غلط ترجمانی کی اور وہ کن توہمات میں مبتلا تھے، ورنہ میں شاید زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنی رائے پیش کر سکتا۔

رہا میرزا صاحب کے بعد احمدی جماعت کا باہمی اختلاف، سو اس کا نہ میرزا صاحب کی ذات سے کوئی تعلق ہے اور نہ تعلیم احمدیت سے۔ یہ جماعت کے بعض مخصوص افراد کا اختلاف ہے، جو نہ ہوتا تو بہتر تھا۔

---

۷) رہا ان کا اجتماعی نظام، وہ بوہرہ، اور اسماعیلیہ شیعوں کی تنظیموں سے زیادہ کمزور ہے۔ ان میں احمدیت سے کم کمزوریاں ہیں۔ احمدی جماعت "سلطان جابر" کو بلا چون وچرا تسلیم کر لیتی ہے، اگر متذکرہ بالا فرقے بھی اسلامی سیاسی بنیادوں پر سوسائٹی تعمیر نہیں کر سکے تو احمدیت بھی اس سے کوسوں دور ہے۔

مجھے اس بات میں آپ سے اتفاق ہے کہ محض عقاید ہی اسلام نہیں ہیں۔ اگر صرف زبان سے خدا کو خالق و مالک اور رسول کو صدیق اور

برحق مانا جائے، تو یہ اسلام نہیں ہے، بلکہ اللہ اور رسول کی توہین ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ احمدی لوگ عملاً اسلام پیش کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے کون سے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ کون سی ایسی اسلامی سوسائٹی تعمیر کی ہے جو ممتاز ہو اور جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ یہ وہ تحریک ہے جس سے پورے ہندوستان بلکہ ایشیاء کی تاریخ متاثر ہوگئی۔

(نگار) احمدی جماعت نے اس وقت تک اسلام کی جتنی وزنی خدمت انجام دی ہے۔ اس کا حل اس جماعت کی سالانہ رپورٹوں سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے۔ انھوں نے دنیا کے مختلف گوشوں میں مبلغین بھیج کر قرآن و تعلیمات قرآنی کی حقیقت غیر مسلموں پر واضح کی، لاکھوں روپیہ صرف کرکے مختلف زبانوں میں قرآن کے تراجم مفت تقسیم کئے، بہت سے نادار طلبہ کے وظائف مقرر کرکے ان کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، متعدد شفاخانے قایم کرکے بلا امتیاز مذہب و نسل لاکھوں مریضوں کا مفت علاج کیا اور کر رہے ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک ان خدمات کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو بتائیے کہ اس سے زیادہ آپ اور کیا توقع ان سے رکھتے تھے جو پوری نہیں ہوئی۔

بوہرہ و اسماعیلیہ تنظیم ایک مخصوص جماعتی تنظیم ہے اور ایک محدود دائرہ کے اندر محصور ہے، نہ اسے تبلیغ سے کوئی تعلق ہے، نہ توسیع اسلام سے، بلکہ ان کے نظام کی باطنیت اس کی اجازت بھی نہیں دیتی کہ وہ اپنے مذہبی لٹریچر کی اشاعت کریں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ احمدیت نے سیاسی بنیاد پر کوئی سوسائٹی قایم نہیں کی، کیونکہ ان کا مقصود صرف اسلام کی عالمگیر اخلاقی تعلیم کو پیش کرنا ہے: کہ سیاسی گتھیاں سلجھانا۔

---

(۸) ہندوستان کے تمام مورخ (ہندو، سکھ، مسلمان) اس تحریک کو ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں کبیر پنتھیوں کو تو تمام ہندوستان کے لوگ جانتے ہیں، لیکن انھیں یہ معلوم ہی نہیں کہ احمدیت کیا بلا ہوتی ہے۔ ہاں اگر احمدیت اسلام کے مقدس نام پر قایم نہ کی جاتی، تو بھگتی تحریک کے مواد و ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہوجاتا۔

(نگار) آپ کا یہ کہنا کہ ہندوستان میں تحریک احمدیت سے کوئی واقف نہیں، اتنی صریح غلط بیانی ہے کہ اس کا جواب خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس وقت دنیا کی کون سی تاریخ ہے جو اس جماعت کے ذکر سے خالی ہو، اور وہ کون سا مورخ ہے جس نے ان کی تنظیم کی تعریف نہ کی ہو۔ آپ نے کبیر پنتھی کا ذکر کرکے اپنی عصبیت پر مہر لگادی، کجا کبیر پنتھی تحریک جس کو انسان کی عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں اور کجا احمدی تحریک جس کی بنیاد ہی درستی کردار و اصلاح اخلاق پر قایم ہے۔

---

(۹) ان کے سماجی تعلقات کے بارے میں اتنا عرض ہے کہ بعض مسلمان انھیں رشتہ دینے میں پیشقدمی کرتے ہیں، لیکن یہ حضرات (خصوصاً کشمیر میں) اپنی تیس تیس سالہ جوان بیٹیوں کو شادی سے پہلے ہی بیوہ بنائے بیٹھے ہیں، اور جس کے نتائج روح فرسا ثابت ہو رہے ہیں۔

(نگار) رشتۂ مصاہرت کے سلسلہ میں، اس سے قبل میں اپنی رائے کا اظہار کرچکا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں ان کا اصول بالکل صحیح و درست ہے، اور ان کی کامیابی و جامعیت بڑی حد تک اس طرز عمل پر منحصر ہے۔

---

(۱۰) پروفیسر الیاس برنی مرحوم کی کتاب "قادیانی مذہب" کا معمولی انداز سے ذکر کرکے آپ نے اُن کے ساتھ سخت ظلم کیا ہے۔ وہ "حوالہ جات" جن سے برنی نے "قادیانی مذہب" مرتب کیا اب بھی احمدی حضرات کی کتابوں میں اور خصوصی طور پر میرزا صاحب کی تصانیف میں من وعن موجود ہیں اور آپ اگر غیر جانبداری سے کام لیں اور صرف جذبات کے بہاؤ پر خیالات اور آراء کا سفینہ نہ چلائیں تو آپ بچشم خود وہ حوالہ جات ملاحظہ فرما کر نتیجہ پر پہونچ جائیں گے۔

(نگار) میں نے الیاس برنی کی بھی کتاب دیکھی ہے اور وہ بھی جو اس کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ میری سچی رائے یہی ہے کہ الیاس برنی نے میرزا صاحب کے اقوال نقل کرنے میں کافی تلبیس سے کام لیا ہے، اگر آپ ان مسایل کی صراحت فرادیتے جن میں آپ الیاس برنی سے متفق ہیں تو میں بھی بالتفصیل بتادیتا کہ الیاس برنی نے کہاں کہاں کن تلبیسات سے کام لیا ہے۔

---

(۱۱) رہا یہ سوال کہ کوئی احمدیت کی مخالفت یا حمایت قرآن وحدیث سے لیس ہوکر کرے۔ تو یہ بے ہودگی کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا جس تحریک کے بانی خود اس کو قرآن وحدیث کی مدد سے صحیح ثابت کرنے اور عامۃ المسلمین اور خصوصی طور پر ذہین حضرات کو مطمئن کرنے میں بُری طرح ناکام ہوچکے ہوں، اُسے خواہ مخواہ اُلجھن میں پڑکر کوئی کیوں صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرے۔

(نگار) پہلے آپ یہ تو ثابت کیجئے کہ احمدی تعلیم فلاں فلاں امور میں قرآن وحدیث کی تعلیم کے خلاف ہے۔ کیا وہ خدا کی وحدانیت اور رسالت رسول کے قایل نہیں، کیا انھوں نے عبادات کی صورتیں بدلدی ہیں۔ کیا احکام شریعت میں انھوں نے کوئی ردوبدل کردیا ہے، آخر وہ کیا چیز ہے جس نے آپ ایسے "ذہین حضرات" کو ان کی طرف سے غیر مطمئن کر رکھا ہے، اور آپ کن شواہد ودلایل کی بنیاد انھیں "بری طرح ناکام" ظاہر کرنے کی جرأت کرسکتے ہیں۔
افسوس ہے کہ آپ نے فہرست الزامات تو بڑی لمبی چوڑی مرتب کردی، لیکن کوئی ثبوت آپ پیش نہ کرسکے۔

تاریخ ویدی لٹریچر

نواب سید حکیم احمد

یہ تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب آریہ قوم نے اول اول یہاں قدم رکھا اور اُن کی تاریخی ومذہبی کتاب رگوید وجود میں آئی یہ کتاب صرف ویدی ادب بلکہ اس سے پیدا ہونے والے دوسرے مذہبی وتاریخی لٹریچروں کے لحاظ سے بھی اتنی مکمل چیز ہے اس کے مطالعہ کے بعد کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی اور اُردو زبان میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو خالص موضوع پر اس قدر احتیاط وتحقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔

قیمت چار روپیہ

منیجر نگار لکھنؤ

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا

سلکی ملین

جورجٹ
بجرگ
کریپ
ساٹن
ٹفاٹہ
بشرٹ کلاتھ
شنٹون
نائلن
نٹون

کپڑا

سلکی پرنٹس

فرنچ کوئین
چھوکرہ کوئین
ساٹن فلورنس
گولڈ کریپ
دل بہار
لنن
شنٹون

کپڑا

اونی

گیبرڈین
سوٹنگ
شال
سرج
پانامہ
پرشیا

ان کے علاوہ نفیس سوتی چھینٹ اور اونی دھاگہ

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹڈ جی۔ ٹی روڈ۔ امرت سر

تار کا پتہ: "رین" "Rayon."

ٹیلی فون 2562

سٹاکسٹ = ٹراونکور رین لمیٹڈ۔ برائے سلکی دھاگا اور مومی (سیلوفین) کاغذ

عقل انسانی سے باہر

قدرت نے انسان کو پیدا کیا - انسان نے قدرت کو سمجھنا چاہا، اور یہ سلسلہ زمانۂ نامعلوم سے چلا آرہا ہے، لیکن نہ اس وقت تک عمل تخلیق بند ہوا اور نہ انسان قدرت کو سمجھ سکا -

موجودہ علوم کی ترقی نے کائنات کے بہت سے پردے اٹھا دئے ہیں - بہت سے گوشوں کی تاریکی دور کردی ہے لیکن ٹھیک اسی وقت جب انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں نے سب کچھ سمجھ لیا، قدرت دفعتًا ایک ایسا شعبدہ چھوڑ دیتی ہے کہ وہ پھر حیران و متحیر ہو جاتا ہے -

اس وقت ڈاکٹری، بایولمسٹری، طبیعیات وغیرہ نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ حیات انسانی کا کوئی راز اس سے پوشیدہ نہیں، لیکن با اینہمہ وہ بدستور عاجز ہے اور کبھی کبھی اسے قدرت کے سامنے سپر ڈال دینا ہی پڑتی ہے - مثلاً :-

۱ــ حال ہی میں ایک ایسا شخص لندن اسپتال میں داخل ہوا، جو ہر لحاظ سے نہایت صحیح و توانا تھا، اور کوئی شکایت کسی قسم کی اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی سوا اس کے کہ اس کے کانوں سے ہر بیس پچیس منٹ کے بعد "چٹ چٹ" کی آواز پیدا ہوتی رہتی ہے اور دور تک سنی جاتی ہے - یہ آواز بالکل اسی قسم کی ہے جیسی بجلی کی چنگاری سے پیدا ہوتی ہے، لیکن جب وہ ہو جاتا ہے تو یہ آواز بند ہو جاتی ہے -

یہ شخص مہینوں تک اسپتال میں رہا اور لندن کے تمام مشہور ڈاکٹروں نے اس آواز کا سبب جاننے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ رہے -

---

۲ــ او ہایو میں ایک انسان اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے - یعنی اس کا دماغ وائرلس لہروں سے اس درجہ متاثر ہوتا ہے کہ ریڈیو کے تمام پروگرام وہ از خود سنا کرتا ہے - گویا وہ بذات خود ریڈیو سیٹ ہے - تمام ماہرین فن نے اس کے دماغ کے ہر ہر حصہ کی جانچ کی لیکن وہ یہ نہ جان سکے کہ اس کے دماغ کے تار و پود کا وہ کون سا حصہ ہے جو ان برقی تموجات کو اتنی تکمیل کے ساتھ قبول کرلیتا ہے -

مہینوں کی تحقیق کے بعد وہ صرف اتنا معلوم کرسکے کہ اس کے سر پر جب کسی دھات کی پٹی باندھ دیجاتی ہے تو برقی تموجات کا یہ اثر ختم ہو جاتا ہے -

---

۳ــ روس کے علاقہ قفقاز میں کاشتکار طبقہ کی ایک لڑکی ہے جو مجسم برق و مقناطیس ہے اور جب وہ کسی راستہ سے گزر جاتی ہے تو زمین پر پڑی ہوئی دھات کی تمام اشیاء (مثلاً سوئی، آلپین، کیل وغیرہ) اس کے جسم سے چپک جاتی ہیں - کبھی ایسا بھی ہوا کہ آلپین کا ایک پیکٹ کھل کر زمین پر گر پڑا لیکن جب اس نے

اپنا ہاتھ بڑھایا تو تمام آلپنیں از خود اس کی مٹھی میں آگئیں۔
روس کے تمام ماہرین نے اس کا حقیقی سبب جاننے کی کوشش کی، لیکن کوئی نہ سمجھ سکا کہ اس میں یہ مقناطیسیت کیوں اور کہاں سے آگئی۔

---

۴ ــــ فطری قانون ہے کہ انسان کا قد عمر کے ساتھ ۲۰ - ۲۵ سال تک بڑھتا رہتا ہے، لیکن ایک شخص دیانا میں ایسا ہے جس کا قد عمر کے ساتھ گھٹتا جا رہا ہے۔
اول اول تو اس کا قد بڑھتا رہا لیکن جب وہ پانچ فٹ چار انچ کا ہوگیا تو ایک انچ سالانہ کے حساب سے اس کا قد چھوٹا ہونے لگا یہاں تک کہ وہ صرف چار فٹ دو انچ کا رہ گیا اگر وہ ضرورت سے زیادہ لمبا ہوجاتا یا بونا پیدا ہوتا تو اس کا سبب اس کے بعض غدود کا نقص قرار دیا جاسکتا تھا۔ لیکن جسم انسانی کو چھوٹا کر دینے والا کوئی غدود انسان کے جسم میں موجود نہیں۔ اور ڈاکٹر آج تک اس معمہ کو حل نہیں کرسکے۔

---

۵ ــــ مشرقی افواج میں ایک سپاہی تھا جس کا نام "عبدالسعید" تھا جس کی عمر صرف ۱۸ سال کی تھی، لیکن اس عمر میں اس کا قد ۸ فٹ تین انچ تک پہونچ گیا۔ وہ گویا ایک چلتا پھرتا ستون تھا، اس غیر معمولی درازی قد کی بنا پر وہ فوج سے علٰحدہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ کہیں اور ملازم ہوگیا اور یہاں سے بھی نکالا گیا۔
انسان کے جسم کی درازی کا تعلق ایک خاص غدود سے ہے اور جب وہ ضرورت سے زیادہ کام کرنے لگتا ہے تو انسان کا قد غیر معمولی طور پر بہت بڑھ جاتا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اس شخص کا یہ غدود بھی اپنی معتدل حالت میں تھا۔

---

۶ ــــ قبل از وقت جسمانی و دماغی نشو و نما کی مثالیں کبھی کبھی نظر آجاتی ہیں اور ان میں بعض بڑی حیرتناک ہوتی ہیں مثلاً آسٹریلیا میں ایک لڑکا "رابرٹ ڈیوک" ہے جو دوسرے بچوں کی طرح معمولی جسامت کے ساتھ پیدا ہوا، لیکن اس کے بعد اس کے نشو و نما نے حیرت انگیز صورت اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ سات سال کی عمر میں اسے روزانہ داڑھی مونڈنی پڑی اور ۵ سال کی عمر میں سیمنٹ کا بورا اٹھانے لگا۔

---

۷ ــــ نوم طویل مشہور مرض ہے لیکن اس کی بھی بعض عجیب و غریب مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ جنوبی افریقہ کی ایک ۲۰ سال کی جوان عورت (اینا سوپولی) نے جب اس کو اپنے شوہر کی موت کی اطلاع ملی تو وہ غش کھاکر گر پڑی اور مسلسل ۳۱ سال تک اسی غشی یا نوم طویل میں مبتلا رہی۔ یعنی ۱۹۱۰ء میں اس پر نیند کا دورہ پڑا اور ۱۹۴۱ء میں وہ بیدار ہوئی۔ یہ تمام زمانہ اس نے ایک اسپتال میں بسر کیا، جہاں ہر دو گھنٹہ کے بعد مصنوعی ذرائع سے اسے دودھ وغیرہ دیا جاتا۔ وہ جب بیدار ہوئی تو سوکھ کر کانٹا ہوچکی تھی اور اپنے شوہر کی یاد اس کے دل سے بالکل محو ہوگئی تھی۔ بعد کو وہ بالکل تندرست ہوگئی اور عمر طبیعی تک پہونچ مری۔

---

۸ ــــ امریکہ میں ایک شخص کے آنکھ کے ایک ڈھیلے میں صرف (ل) منقوش تھا اور دوسری آنکھ کے ڈھیلے میں حرف (D)۔ یہ دونوں حرف بالکل صاف نظر آتے تھے گویا کسی نے قلم سے لکھدئے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہی دونوں اس کے نام کے ابتدائی حرف بھی تھے۔ کیونکہ اس کا نام John Dickens تھا۔

ورسٹڈ ویونگ اور ہوزری یارن

کی

ضروریات کی تکمیل کے لئے، یاد رکھئے

حرفِ آخر

کپور سپن

KAPUR SPUN

ہی ہے

تیار کردہ - کپور سپننگ ملز - ڈاک خانہ رآن اینڈ سلک ملز - امرت سر

ڈال ڈال پات پات

(جناب برہم ناتھ دت کا مجموعۂ مکاتیب)

انشاء فایقہ، جذبات عالیہ اور ندرت بیان کا ایسا دلکش مرقع جو صنف مکتوب نگاری میں اپنا مثل نہیں رکھتا۔

خواجہ غلام السیدین اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :-

"ان خطوں میں نیکی، شرافت و انسانیت کا وہ احترام ہے جو زمان و مکان دونوں کی حد بندیوں سے آزاد ہے، ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے جس میں ادب، تاریخ، مذہب و فلسفہ سبھی آجاتے ہیں"

ڈیٹر نگار کہتے ہیں :-

"یہ معمولی خطوط کا مجموعہ نہیں، بلکہ نہایت لطیف و دلچسپ داستان ہے خود دت صاحب کی پاکیزگی اخلاق کی، ان کی وسعت نظر کی جو ادب و انشاء کے لحاظ سے ایک آبشار گہربار ہے اور معنوی حیثیت سے پند نامۂ فرید الدین عطار!"

ضخامت ۲۵۶ صفحات - کاغذ سفید ۲۴ پونڈ، مجلد، رنگین - قیمت علاوہ محصول تین روپیہ

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

حشر سے پہلے

(دانش فرازی)

(۱)

ہنوز ساحلِ عقبہ کے پاک خیموں سے
جگا رہا ہے زمانے کو نغمۂ داؤد،
اک ارتعاش سا پیدا ہے دشت و وادی میں
بھڑک رہا ہے ہر اک سمت شعلۂ بے دود
سنو کہ درد سے کہتا ہے یہ رسولِ زبور
کہ اے خدائے جلیل، اے مرے معبود
میں صلح جو ہوں، حیات آفریں مرا آہنگ
یہ میری قوم ہے کیوں مجھ سے آج درپئے جنگ

(۲)

لہو سے سرخ ہے ہر گام پر جبینِ صلیب
رکی ہوئی سی ہے اب نبضِ ابنِ مریم کی
گلے چونک کے اٹھے ہیں یوں لبِ کہسار
لبوں پہ جان ہے "برگ و نوائے عالم کی"

(۳)

کلیمِ طور کے ہونٹوں پہ ثبت مہرِ سکوت
بجھی بجھی سی ہے ہر وقت وادیِ ایمن،
فراعنہ ہیں خدا جانے کتنے درپئے کار
خزاں کے خوف سے لرزاں ہے زندگی کا چمن
اٹھے ہیں خواب سے افسوں گرانِ مصرِ قدیم
چھپائے اپنے گریباں کی تہ میں لاکھ کفن

(۴)

بھڑک کے شعلہ بنے گا شرارِ بو لہبی
یہ کہہ رہی ہے "جفائے وفا نما" مجھ سے
ہنوز غولِ حریفاں ہے دشتِ طائف میں
عجب ہے کیا جو حقیقت پہ پڑ گئے پردے
یہ کیسا شور ہے ہمرنگ صورِ اسرافیل
یہ کیسا حشر کا عالم ہے حشر سے پہلے

(شفا گوالیاری)

کسی افتاد سے غمگیں نہ ہوئے دیوانے
مسکراتے ہوئے گزرے یہ جدھر سے گزرے
ظلمتوں میں رہا ضو پاش تصور ان کا
ہم شبِ ہجر کئی بار سحر سے گزرے

(روش صدیقی)

کیا سفر تھا خارزارِ عشق کا — جیسے کوئی جادۂ گل پر چلے
گرم تھا ہنگامۂ دار و رسن — واعظِ دیں جانبِ منبر چلے
آج رازِ جام و مینا کھل گیا — تشنہ لب آئے، چشمِ تر چلے
کیا کریں، ہم اے دلِ خانہ خراب — پھر اُسی نا آشنا کے گھر چلے
اپنی مے نوشی کی ساعت آگئی — اشکبار آنکھوں کے ساغر بھر چلے

سخت پُر آشوب عالم ہے روشؔ
آپ میخانے سے کیوں اُٹھ کر چلے۔

(جناب شارقؔ ایم۔ اے)

کبھی کبھی وہ ساعتیں بھی آئیں ان کی یاد میں — ضیا سمٹ کے آگئی جہاں جہاں نظر گئی
نہ آرزوئے بتکدہ، نہ ذوقِ سجدۂ حرم — یہ کس مقامِ جستجو پہ زندگی ٹھہر گئی
دھواں چمن میں جب اُٹھا گری ہے برق جب کہیں — کسے خبر کہ بیکسوں کے دل پہ کیا گزر گئی

کسی نے بخش دیا مجھ کو عمر بھر کے لئے — وہ ایک غم جسے ہر غم کی آبرو کہئے
نہ پوچھ مجھ سے مرے دل کا ماجرا اے دوست — یہ وہ فسانہ نہیں جس کو کو بہ کو کہئے

(شفقت کاظمی)

اک بار فریب کھا گئے تھے — اب تک ہیں کسی سے بدگماں ہم
بڑھتی گئی منزلوں کی دوری — ہوتے گئے گردِ کارواں ہم
دل میں تھیں کچھ ایسی حسرتیں بھی — تجھ سے جو نہ کر سکے بیاں ہم
کچھ بس نہ چلا تری جفا پر — دیکھا کئے سوئے آسماں ہم
جب پوچھ رہے تھے آپ ہم کو — اُس وقت نجانے تھے کہاں ہم

(الطاف شاہد)

بیدادِ کم نگاہی ساقی نہ پوچھئے — کیا جانے کتنے شیشۂ دل چور ہو گئے
وہ آشنائے رازِ محبت نہیں مگر — جو لوگ عرضِ شوق پہ مجبور ہو گئے

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

صافی

معدہ کے فعل کو دُرست کرتی ہے۔ بھوک کو
بڑھاتی ہے اور صاف و صحت مند خون پیدا کرتی ہے۔

ہمدرد دہلی - کانپور - پٹنہ

مطبوعات موصولہ

ہم قلم پاکستان رائٹرس گلڈ کراچی کا ماہنامہ ہے جو پچھلے دو سال سے شایع ہو رہا ہے۔ حال ہی میں اس نے اپنا سالنامہ شایع کیا ہے جو ۳۸۲ صفحات کو محیط ہے۔ اس کا نصف سے زیادہ حصہ پاکستان رائٹرس کنونشن کی رپورٹ کے لئے وقف ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دو سال میں اس ادارہ نے کافی وسعت و اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اور پاکستانی ادیبوں کا بڑا حلقہ اس سے وابستہ ہو گیا ہے۔

اس میں شک نہیں رائٹرس گلڈ کے قیام نے پاکستان کے ادبی حلقوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے اور اگر وہاں کے اہل قلم نے اپنے صحیح فرایض کو پورا کیا تو اس سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

اس سالنامہ کا پہلا حصہ ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے اور مضامین کے لحاظ سے کافی اہم۔ لیکن وہی ایک چیز جو اس وقت پاک و ہند کے تمام رسایل میں مجھے قابل اعتراض نظر آتی ہے، ہم قلم میں بھی موجود ہے، یعنی اس کو دیکھ کر ادب کا جو تصور ہمارے سامنے آتا ہے وہ شعر و سخن اور افسانہ نگاری سے آگے نہیں بڑھتا، حالانکہ "ادبیات" میں تمام وہ علوم شامل ہیں جو ذہنی تربیت و ارتقاء کا سبب بن سکیں اور انھیں کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ عموماً رسالوں کا ایک حصہ صرف غزلوں اور نظموں کیلئے وقف ہوتا ہے جو بہت جلی خط میں پھیلا کر پھیلا کر شایع کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم قلم کے سالنامے میں بھی قریب قریب ۱۰۰ صفحات نظموں، غزلوں کے لئے وقف ہیں جن میں اکثر قدر دوم کی تخلیقات ہیں اور "واہ واہ" کی بھی مستحق نہیں۔

عام طور پر رسایل کا ایک حصہ اُن خطوط کے لئے بھی وقف ہوتا ہے جو رسالہ کی تعریف میں دفتر کو موصول ہوتے ہیں۔ یہ نہایت پست قسم کا پروپاگنڈا ہے جس سے معیاری رسایل و جراید کو احتراز کرنا چاہئے۔ (ہم قلم کے سالنامہ میں البتہ ایسے خطوط نظر نہیں آتے)

ہم قلم ایک نیم سرکاری ادارہ کا رسالہ ہے، اس لئے اس کی سطح یقیناً عام رسایل سے زیادہ بلند، زیادہ افادیت پسند ہونا چاہئے اور ان جراید و رسایل کی تقلید اس کو نہ کرنا چاہئے، جن کا مقصد کچھ اور ہے۔ اسے صرف وہی مضامین شایع کرنا چاہئے جو معلومات میں اضافہ کرنے والے ہیں اور محض جذبات کی تسکین سے تعلق نہیں رکھتے، ضرورت ہے کہ رسالہ کو چند مخصوص ابواب میں تقسیم کر دیا جائے (مثلاً تاریخ، سائنس، تنقید، اقتصادیات، نفسیات، سیاست، مسایل حاضرہ، فنون لطیفہ) اور مستقلاً ان تمام عنوانات پر مضامین شایع کئے جائیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ افسانوں اور منظومات کی اشاعت یک لخت ترک کر دی جائے، لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ چند صفحات سے زیادہ ان کو جگہ نہ دی جائے اور نظمیں اور غزلیں تو التزاماً اصلاح و تنقید کے بعد شایع کی جائیں اور یہ خدمت ایک کمیٹی کے سپرد کی جا سکتی ہے اگر اڈیٹر تنہا یہ ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا۔

اس میں شک نہیں رائٹرس گلڈ کے قیام سے پاکستان کے ادبی حلقوں میں کافی آثارِ حیات پیدا ہو چلے ہیں۔ لیکن ضرورت ہے کہ حکومت کی طرف سے جو امداد ملتی ہے اس کو اس طرح صرف کیا جائے کہ ادارہ کی بنیاد مضبوط ہو جائے اور آیندہ وہ حکومت کی امداد کا محتاج نہ رہے۔ ہر چند تمام ادیبوں سے تجارتی اصول کی پابندی کی توقع رکھنا درست نہیں، لیکن اس جماعت میں

یقیناً بعض ایسے ادیب بھی شامل ہیں جو اس اصول کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور ان کی خدمات اس سلسلہ میں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

علی گڑھ تحریک

ڈاکٹر نسیم قریشی کی ادارت میں علی گڑھ میگزین کا سالنامہ ۱۹۵۵ء میں شایع ہوا تھا اور اس میں سرسید اور قیام یونیورسٹی کے متعلق کافی معلومات یکجا کر دی گئی تھیں۔ اب یہی سالنامہ کافی اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے اور اس کی ترتیب و تہذیب کے ذمہ دار بھی ڈاکٹر نسیم قریشی ہی ہیں۔

اس کتاب میں علی گڑھ تحریک کا شروع سے لے کر اس وقت تک کا جایزہ لیا گیا ہے اور سرسید کے مذہبی و قومی کارناموں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کتاب کسی ایک شخص کی تصنیف نہیں بلکہ مختلف عنوانات پر مختلف باخبر اہل قلم حضرات کی تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں سرسید کے فکر و خیال کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے علی گڑھ تحریک کے اسباب اور اس کی تدریجی ترقی پر مختلف زاویوں سے غور کیا گیا ہے۔

سرسید کی زندگی کے دو پہلو بہت نمایاں ہیں ایک ان کے مذہبی فکر و خیال کا، دوسرا قومی خدمات کا اور ان دونوں پہلوؤں پر اس کتاب میں بڑی وضاحت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

اس کتاب میں سرسید، ان کے رفقاء، کالج کے سابق سکریٹریوں، چانسلروں اور وائس چانسلروں کی تصاویر بھی شامل ہیں اور عہد سرسید کے چند یادگار گروپ بھی، جو تاریخی چیز ہیں۔

یہ کتاب نہایت دبیز کاغذ پر ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد شایع ہوئی ہے۔ قیمت دس روپے۔

نئی دھرتی پرانے گیت

جناب رام لال کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے، جن میں سے اکثر بلکہ شاید سب کے سب مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔

عہد حاضر کے تمام افسانہ نگاروں میں اس وقت تنہا رام لال ہی ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کی اکثر کہانیاں جنسیاتی مسایل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں یہ بڑی دشوار گزار راہ ہے اور اس کے خارزار سے دامن بچا کر نکل جانا آسان نہیں، لیکن رام لال صاحب کو اس "جام و سنداں باختن" کا خاص سلیقہ حاصل ہے اور شدید ہیجانی مواقع پر بھی ان کا قلم سنجیدگی ہی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

یہ کتاب ۱۸۰ میں میسرز کے دھون اس چھابڑو۔ چندر نگر۔ عالم باغ لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

گلی گلی

یہ بھی مجموعہ ہے رام لال صاحب کے پندرہ افسانوں کا جن میں مختلف عنوانات کے تحت زندگی کی مختلف راہوں اور ان راہوں کی مختلف پیچیدگیوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔

کہانی کے کردار خود کہانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ پیدا کئے نہیں جاتے اور یہی رکھ رکھاؤ اصل حسن ہے فسانہ نگاری کا۔ رام لال صاحب کو اس باب میں بڑا سلیقہ حاصل ہے۔ وہ اپنے فسانوں کی تار و پود میں فسانہ کے کردار کو ہم پر For ce نہیں کرتے، بلکہ وہ از خود فسانہ سے ابھر کر اس طرح ہمارے سامنے آجاتے ہیں، گویا یہ سب کسی میکانکی حرکت و جنبش کا نتیجہ ہے۔

حیرت ہے کہ رام لال صاحب کیونکر گلی گلی کی خاک چھان کر یہ ریزہ ہائے تابناک جمع کر لیتے ہیں۔

قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ پنچ پبلشرز۔ سروری منزل۔ امین آباد۔ لکھنؤ۔

اسرار کائنات

تصنیف ہے جناب ڈاکٹر سید اختر احمد صاحب کی جو باوجود مختصر ہونے کے بڑی مفید ہے۔ اسرار کائنات سے ان کی مراد عالم تخلیق کے غوامض و نکات کی صراحت نہیں ہے، بلکہ اس وقت دنیا جس راہ پر

چل رہی ہے اس کا جایزہ لے کر بتایا ہے کہ وہ کس درجہ خطرناک راہ ہے اور نظام عالم کے لئے کتنی تباہ کن۔
انھوں نے دنیا کے تمام موجودہ مواقف تمدن (حکومت، سیاست، تجارت، صنعت وحرفت وغیرہ) کا احتساب کرتے ہوئے ایک ایسے عالمگیر امن وسکون کا خاکہ پیش کیا ہے کہ اگر اکابر عالم اس پر غور کریں تو معاشرہ وسیاست کی اکثر الجھنیں دور ہوسکتی ہیں۔
قیمت ۱۲ر- پبلشرز شعبہ ادب پالی اسٹڈی سرکل حیدر آباد (دکن)

دین اسلام اُردو ترجمہ ہے مولانا محمد علی مرحوم (احمدی) کی انگریزی تصنیف دی ریلیجن آف اسلام کا۔ مولانا محمد علی کی علمی و مذہبی خدمات سے ہر شخص واقف ہے اور جن حضرات نے ان کا ترجمۂ قرآن مع تشریحی استدراکات کے انگریزی میں دیکھا ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ بلحاظ علم وفضل کس مرتبہ کے انسان تھے۔ انھوں نے علاوہ ترجمہ قرآن کے اور بھی متعدد کتابیں انگریزی میں تصنیف کی تھیں جن میں ایک وہ بھی ہے جس کا اُردو ترجمہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔
یہ ترجمہ کا دوسرا حصہ ہے۔ (پہلا حصہ ہماری نگاہ سے نہیں گزرا)۔ اس میں نماز، روزہ، حج وزکوۃ کے فلسفہ اور ان کے برکات وخصوصیات پر بڑی تسکین بخش بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے ۶ ابواب منور زیر ترجمہ ہیں جو بعد کو شایع کئے جائیں گے۔
یہ کتاب دارالکتب اسلامیہ، احمدیہ بلڈنگس لاہور سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

۱۹۵۸ء کے بہترین افسانے ایم حبیب خاں نے گیارہ افسانے مشہور فسانہ نگاروں کے اس عنوان سے شایع کئے ہیں۔ انھوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ۵۸ء کے بہترین افسانے صرف اتنے ہی ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ جن افسانوں کا انھوں نے انتخاب کیا ہے وہ یقیناً اچھے ہیں اور نہ صرف موضوع بلکہ خصوصیات فسانہ نگاری کے لحاظ سے بھی ان میں بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں، گو زبان کے لحاظ سے البتہ بعض افسانوں کو معیاری یا بہترین نہیں کہا جاسکتا، لیکن اس زمانہ میں جبکہ زبان دلطف زبان سے بیگانگی بڑھتی جارہی ہے یہ شکایت بیکار ہے۔
ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اُردو علی گڑھ۔ ضخامت ۱۳۶ صفحات۔ قیمت ۴ر جو یقیناً زیادہ ہے۔

ناصبیان ملک غصوص یا "تاریخ معاویہ ویزید" دونوں تاریخی نام ہیں اس کتاب کے جن سے ۱۹۶۰ء اور ۱۳۸۰ھ کے اعداد مستخرج ہوتے ہیں۔
یہ کتاب پہلا حصہ ہے جناب سید نہال احمد صاحب نقوی امروہوی کی تحقیق کا جس میں انھوں نے احادیث وروایات سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ امیر معاویہ اور یزید دونوں غاصب خلیفہ تھے اور خلافت کے صحیح حقدار علی اور ان کے فرزند حسن حسین تھے۔
یہ کوئی نئی بحث نہیں، اس پر فریقین کی طرف سے بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور آیندہ بھی لکھا جائے گا، لیکن عقاید ومذہب سے ہٹ کر اس مسئلہ پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ روایات کا تو یہ عالم ہے کہ شیعی، ناصبی، خارجی بھی ان سے فایدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ روایات سے ہٹ کر خالص تاریخی وسیاسی حیثیت سے اس پر غور کیا جاتا اور اسی کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے شیعی نقطۂ نظر سے جو کچھ لکھا ہے وہ بظاہر اتمام حجت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اخلاق کی بلندی کے لحاظ سے علی اور حسین — معاویہ ویزید سے بدرجہا بہتر تھے، اور قطعاً اس کی ضرورت نہ تھی کہ اس سلسلہ میں مشکوک موضوع روایات کو پیش کیا جاتا۔ لیکن فاضل مصنف نے از راہ غلو کہیں کہیں ان روایات سے بھی کام لیا ہے اور یہی اس کتاب کا کمزور پہلو ہے۔ تاہم اس میں بعض ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو یقیناً قابل تردید ہیں اور اس کتاب کا یہی درایتی پہلو اس کی بڑی خوبی ہے۔ کتاب ۴۰۰ صفحات کو محیط ہے اور کاشانۂ بڑا دربار

امروہہ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

شبنم شبنم مجموعہ ہے جناب کرشن موہن کی غزلوں، نظموں، قطعات و رباعیات کا۔ غزلیں نسبتاً کم لیکن پاکیزہ، نظمیں کچھ زیادہ ہیں اور لطیف! شاعری دنیا کی بڑی پرانی چیز ہے، اتنی پرانی کہ اگر آپ چاہیں تو اسے ازلی بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن باایں ہمہ وہ پھر بھی نئی ہے اور ایک جدید چیز کی طرح لذیذ۔ کرشن موہن کا کلام بھی اسی تحت میں آتا ہے۔

کرشن موہن سرزمین پنجاب کے ان چند گہرہائے آبدار میں سے ہیں جنھیں تقسیم ہند کا سیلاب یہاں بہا لایا اور اب وہ یہیں عروسِ سخن کے زیب گلو ہیں، کرشن موہن نومشق شاعر نہیں ہیں، ان کی مشق سخن ۲۰ سال کی ہے اور اس دوران میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس کی پہلی قسط یہ مجموعہ ہے۔

ان کے کلام میں بڑی لطافت و دلکشی ہے۔ وہ بہت کم جذبۂ مستعار سے کام لیتے ہیں، اور ان کی شاعری کا تار و پود خود انھیں کا ذاتی فکر و احساس ہے جو نظموں میں زیادہ وسعت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔

زبان و انداز بیان کے لحاظ سے بھی ان کا کلام نہ تاویل طلب ہے نہ ناقابلِ فہم اور عہد حاضر کے شعراء میں یہ بات بہت کم کسی شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

طباعت و کتابت وغیرہ کے لحاظ سے بھی یہ کتاب قدر اول کی چیز ہے۔

قیمت پانچ روپیہ - ملنے کا پتہ :- انڈین اکاڈیمی ۲۹، نریندر پلیس - نئی دہلی۔

آہنگ غزل مجموعہ ہے جناب پورن سنگھ ہنر امرتسری کی نظموں اور غزلوں کا۔ جناب ہنر پنجاب کے مشہور ادیب و شاعر ہیں اور اس وقت تک ان کی ساری زندگی شعر و ادب ہی کی خدمت میں صرف ہوئی ہے۔

ہنر کے کلام میں جو سوز و اثر جو واقعیت و صداقت اور فکر و خیال کی جو بلندی پائی جاتی ہے وہ صرف ان کی کہنہ مشقی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی فطری صلاحیت اور پاکیزگی ذوق کا بھی تصرف ہے، جو یکسر وہبی چیز ہے اور اکتساب سے اس کا کم تعلق ہے۔

جناب ہنر جذباتی شاعر ہیں لیکن صرف حسن و عشق کے سطحی جذبات کی حد تک نہیں بلکہ ان کی نظر اس سے ماوراء ان فضاؤں تک بھی پہونچ جاتی ہے، جہاں عامۃ الورود خیال کا گزر نہیں۔

ذیل کے اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ غزل کا کتنا اچھا ذوق رکھتے ہیں :-

وہ لذتیں ہیں تلخی غم میں کہ اب مجھے — ان کا بھی التفات گوارا نہیں رہا
خدا جانے آل سجدہائے عشق کیا ہوگا — جبیں فرسود ہے سنگ درجانانہ برسوں سے
فضائے لامکاں ہے اور میں ہوں — نشاط جاوداں ہے اور میں ہوں
وارفتگی دل میں کمی آج بھی نہیں — وہ آگئے ہیں اور مجھے آگہی نہیں
دیار عشق میں آتے ہیں ایسے بھی مقام اکثر — جہاں تیرے کرم کو بھی جفا کہنا ہی پڑتا ہے

یہ مجموعہ ۸ء میں حلقہ ارباب ۱۸۱۰ کٹڑہ باگھ سنگھ امرت سر سے مل سکتا ہے۔

طلوع سحر مجموعہ ہے جناب امجد نجمی کی نظموں کا۔ جناب نجمی کٹک (اڑیسہ) کے مشہور خوشگو شاعر ہیں اور زبان و بیان کی صحت و پاکیزگی کے لحاظ سے ہندوستان کے صف اول کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ طلوع سحر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری میں جناب نجمی کی انفرادیت صرف وسعت مطالعہ کا نتیجہ نہیں بلکہ اس میں فطری صلاحیت کو بھی بڑا دخل ہے۔

ان کی شاعری الفاظ کی بازیگری نہیں، بلکہ معنوی بلندی اور سنجیدہ فکر و نظر کی بھی ایسی اچھی مثال ہے کہ اردو شاعری میں

بہت کم کہیں اور نظر آتی ہے - اس مجموعہ میں رومانی، اخلاقی، سیاسی سبھی قسم کی نظمیں ہیں اور ان میں سے کوئی ایسی نہیں جسے قدر دوم کی چیز کہہ سکیں - یہ مجموعہ دو روپیہ میں اُڑیسہ اُردو پبلشرز، دیوان بازار کٹک سے مل سکتا ہے -

سائنس کی دُنیا ولیم ایچ کراؤز، سائنسی مصنف ہے - اسی کی ایک کتاب کا ترجمہ اس نام سے حال ہی میں شایع ہوا ہے یہ کتاب نوعمر طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے اس کی زبان، سادہ اور اسلوب بیان بہت شگفتہ ہے اسکے مترجم جناب ایم - ایم بیگ (پرنسپل دلی کالج) ہیں اور انھوں نے ترجمہ میں اس کا پورا لحاظ رکھا ہے کہ وہ ثقیل نہ ہونے پائے اور آسانی سے ہر شخص کی سمجھ میں آجائے -

اس کتاب میں بھاپ، گرمی، بجلی، روشنی، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، فوٹوگرافی وغیرہ متعدد موضوع پر سائنسی معلومات و توجیہات کو پیش کیا گیا ہے اور نقوش و تصاویر کی مدد سے انھیں اور زیادہ لیسیر الفہم بنا دیا ہے -

قیمت ۳ے ر - ملنے کا پتہ :- انڈین اکاڈیمی ۲۹ - نرینڈرا پیلس - نئی دہلی -

ہزاروں سال پہلے ابن حنیف کی تالیف ہے اور بڑی دلچسپ و مفید، اس میں انھوں نے بعض ایسی مذہبی و اساطیری ہستیوں کا ذکر کیا ہے جن کا نام تو ہم سب جانتے ہیں، لیکن پہچانتے کسی کو نہیں -

ابراہیم، نوح، یوسف، موسیٰ، اخناتون اور عشتار وغیرہ مشہور روایاتی ہستیاں ہیں، لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے ان کی کیا حقیقت ہے یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں -

اس کتاب میں مذہبی روایات سے ہٹ کر صرف تاریخ کو سامنے رکھا گیا ہے اس لئے اس کی حیثیت ایک علمی کتاب کی سی ہے - جابجا تصاویر و نقوش سے بھی کام لیا گیا ہے جس سے اس کی دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی ہے -

قیمت ۲ے - ملنے کا پتہ :- مکتبۂ کارواں کچہری روڈ - لاہور -

گردِ کارواں مجموعہ ہے جناب کنھیالال کپور کے پندرہ مزاحیہ مضامین کا جسے انڈین اکاڈیمی - ۲۹ - نرینڈرا پیلس نئی دہلی نے حال ہی میں شایع کیا ہے -

کوئی شاعر و ادیب نیا ہو، تو اس پر کچھ لکھئے بھی - لیکن ٹکسالی قسم کے مصنفین پر اظہار خیال کا موقع اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب وہ کوئی سخت ٹھوکر کھائیں اور کپور صاحب کے یہاں یہ ٹھوکریں بہت کم ہیں -

کپور صاحب مزاحیہ نگار کہلاتے ہیں، لیکن میری رائے میں ان کو طنز نگار کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کیونکہ ہم ان کی تحریر پڑھ کر ہنسنے پر مجبور نہیں ہوتے، بلکہ ایک نشاط انگیز فکر کی کیفیت اپنے اندر محسوس کرتے ہیں اور ادب لطیف میں یہ رنگ پیدا کرنا آسان نہیں -

کاکل صبح مجموعہ ہے جناب عشرت کرتپوری کی غزلوں اور بعض نظموں کا جو بہ لحاظ اسلوب بیان، بغیر کسی تکلف و تامل کے غزلیں ہی کہی جا سکتی ہیں - یعنی ان کے یہاں نظم کا صحیح ارتقا بھی ہے اور غزل کی وسیع تعبیر بھی -

عشرت کرتپوری کے کلام کی دردمندانہ کیفیت غالباً نتیجہ ہے نہ صرف ان کی زندگی کے تلخ تجربات کا، بلکہ ایک فلسفیانہ مطالعہ اور اس قوت صبر و تحمل کا بھی جو نیش و نوش دونوں کے فرق و امتیاز سے بے نیاز ہے -

جناب عشرت کے کلام میں اگر کہیں کہیں کمزوریاں پائی جاتی ہیں تو تعجب کی بات نہیں کیونکہ ان کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ وہ اس دور ناپختگی میں بھی ایسے ایسے شعر کہہ جاتے ہیں :-

اس قدر گہرا تعلق تو نہ تھا تجھ سے کبھی
جانے کیوں بے چین ہوں تیرے چلے جانے کے بعد

تیری اُلفت کی راہ میں دل نے
ہر قدم پر نئے فریب دئے

تھا کس قدر عزیز ترا غم کہ بارہا
کرنا پڑا گریز غم کائنات سے

یہ مجموعہ ڈھائی روپیہ میں سب رنگ کتاب گھر احاطہ کالے صاحب گلی قاسم جان دہلی سے مل سکتا ہے۔

حج بیت اللہ شریف

جناب مسعود احمد خورشید نے جب حج کیا تو اپنے سفر حج کے حالات بھی قلمبند کرتے گئے۔ جس میں تمام مناسک و شعائر حج کو نہایت وضاحت کے ساتھ قلمبند کر دیا گیا ہے۔ انداز بیان کی سادگی اور متعدد تصاویر نے کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ کتاب چار روپیہ میں ایجوکیشنل پریس کراچی سے مل سکتی ہے۔

الحکمۃ فی مخلوقات اللہ

امام محمد غزالی کی تصنیف ہے جس کا اردو ترجمہ اسی نام سے مولوی محمد علی لطفی نے کراچی سے شایع کیا ہے۔ اس کتاب میں امام غزالی نے بتایا ہے کہ خدا نے چاند، سورج، زمین، سمندر، پانی، ہوا، آگ، جمادات، نباتات، پرند، چوپائے وغیرہ کیوں پیدا کئے۔ ہر چند عہد حاضر میں یہ تمام معلومات نہایت بسیط علمی طریقے سے فراہم ہو چکی ہیں اور امام غزالی نے جو کچھ لکھا ہے وہ بچوں کی سی باتیں ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے لکھا ہے، ضرور قابل لحاظ ہے ابتدا میں امام غزالی کے سوانح حیات بھی شامل کر دئے گئے ہیں اور یہ بڑا مفید اضافہ ہے۔

قیمت ہے۔ ملنے کا پتہ :- شیر شاہ، ڈی بلاک نمبر ۱۵۴ - کراچی

ملفوظات شاہ عبدالعزیز

اردو ترجمہ ہے ایک کتاب کا جو شاہ عبدالعزیز کے کسی مرید نے اس نام سے شایع کی تھی اس میں شاہ صاحب کے ملفوظات کے علاوہ ان کے بعض علمی کمالات اور عملیات کا بھی ذکر پایا جاتا ہے۔

شاہ صاحب اپنے وقت کے بڑے جید عالم و صاحب دل بزرگ تھے اور بڑی دینی خدمات انھوں نے انجام دی تھیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ جو اقوال یا مجربات اس کتاب میں ان سے منسوب کئے گئے ہیں، وہ نقلی و عقلی دونوں حیثیتوں سے استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔

مولوی محمد علی لطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی نے بھی جو اس کتاب کے مترجم ہیں اپنے پیش لفظ میں اس کتاب کی صحت پر شک کا اظہار کیا ہے اور ترجمہ میں حذف و اضافہ سے کام لے کر اس کے بعض اغلاط و نقایص کو دور بھی کر دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ایسی مشکوک کتاب کے ترجمہ کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ اس کی اکثر باتیں قابل اعتناء نہیں۔

شکر ہے کہ ابتدا میں مترجمین نے شاہ صاحب کے مختصر سوانح حیات درج کر کے ایک حد تک اس کتاب میں افادیت پیدا کر دی ہے، ورنہ یونہی اس کا مطالعہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

یہ کتاب سات روپیہ بارہ آنے میں پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز ۱۲ - میری روڈ کراچی سے مل سکتی ہے۔

راج محل

جناب اظہر علی فاروقی نے اب سے بیس بائیس سال قبل جب وہ ادے پرتاب کالج بنارس میں شعبۂ اردو فارسی کے صدر تھے چند ڈرامے طلبہ کے لئے لکھے تھے تاکہ وہ تمثیلی مقابلوں میں اسٹیج بھی کر سکیں۔ یہی ڈرامے کافی حذف و اضافہ کے بعد اب تیسری بار فروری ۶۰ء میں راج محل کے نام سے شایع کئے گئے ہیں۔

یہ مجموعہ صرف چار ڈراموں پر مشتمل ہے جو سب کے سب تاریخی یا نیم تاریخی ہیں۔ پہلا ڈرامہ انجام عہد فرخ سیر سے متعلق ہے، دوسرا تیسرا تزک بابری سے لیا گیا ہے اور چوتھا بھی ہلکا سا تاریخی رنگ لئے ہوئے ہے۔ یہ ڈرامے تمثیلی خصوصیات کے لحاظ سے بڑا دلچسپ لٹریچر ہیں۔ اخیر میں وہ تمام اشارات بھی دیدئے گئے ہیں جن کا جاننا ڈراما کو اسٹیج پر لانے کے لئے ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں بالکل پہلی مرتبہ اس طرف توجہ کی گئی ہے اور اسٹیج کے نقطۂ نظر سے اداکاری کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلق عملی ہدایات اس میں درج نہ ہوں مکالموں کی زبان بھی بڑی شستہ و رواں ہے اور ٹکنک بھی بہت دلچسپ۔ یہ کتاب ادارۂ ادب الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

ضروری
ضروری
ضروری

کوئی بیمار ہے .....
ضروری خبر بھیجنی ہے!
اسے "پرائرٹی" تار سے بھیجئے

بیماری، حادثہ یا موت پر پیغام پرائرٹی تار سروس سے بھیجا جا سکتا ہے۔
پرائرٹی تار کو ارجنٹ یا ایکسپریس تار پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے لئے فیس ایکسپریس تار جتنی ہی لی جاتی ہے۔
اس طرح کا تار بھیجتے وقت لفظ "پرائرٹی" ضرور لکھنا چاہئے

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

محکمہ ڈاک و تار

DA 69/63

نئے بھارت کے معمار

ملک کے لئے زیادہ اناج

آپ سے ملیئے:
آپ ہیں شری سمپت راؤ ہری یادھونے
آپ مہاراشٹر کے ضلع شمالی ستارا نوضع موہٹہ کے
رہنے والے ہیں۔
۱۹۵۹-۶۰ء میں سب سے زیادہ دھان اگانے کا
سرکاری مقابلہ آپ ہی نے جیتا، آپ نے فی ایکڑ
۱۴۹ من دھان اگایا تھا۔

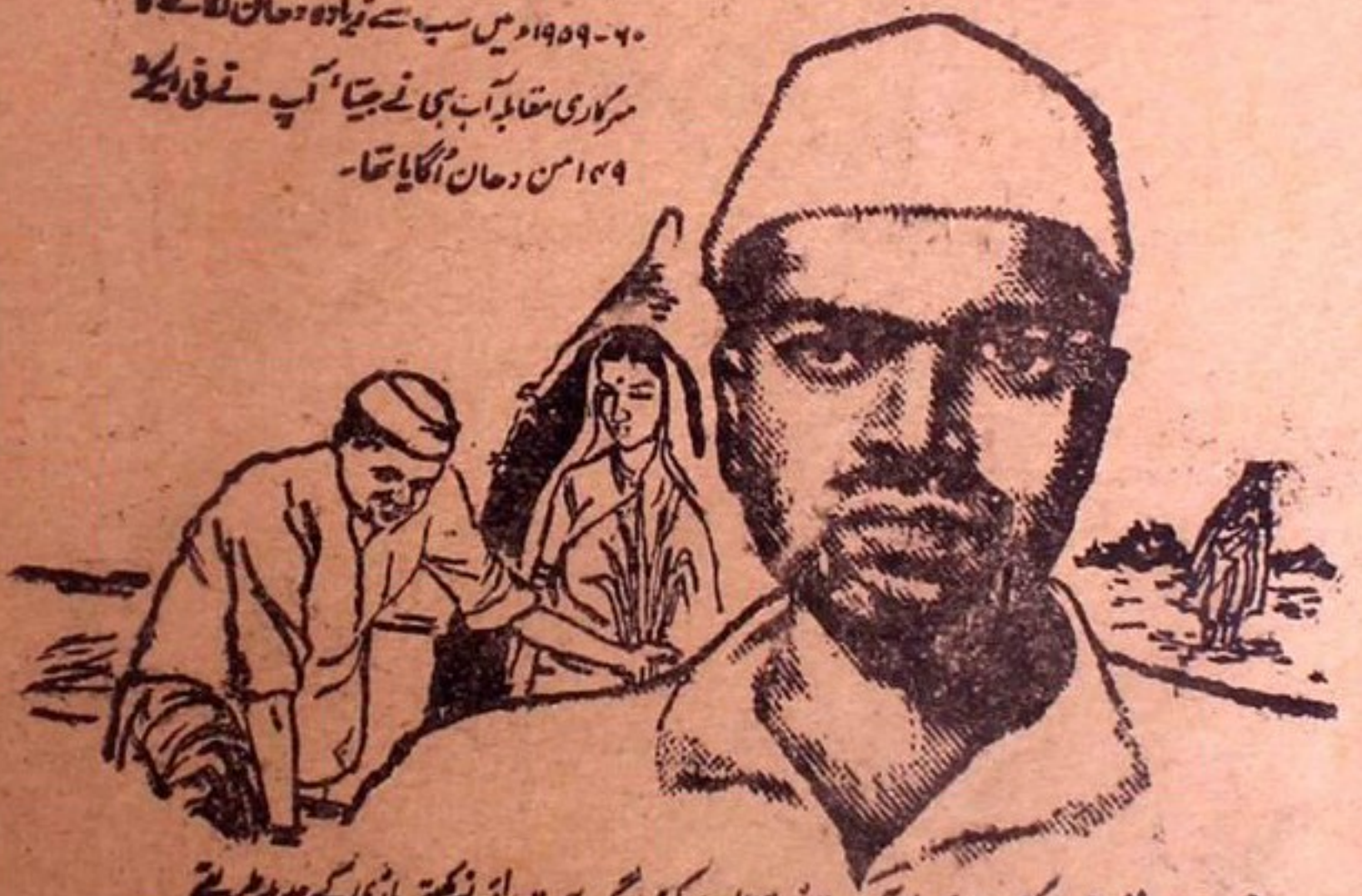

شری سمپت راؤ ہری یا کی کامیابی کا راز آپ یقیناً جاننا پسند کریں گے۔ سمپت راؤ نے کھیتی باڑی کے جدید طریقے اپنائے، مناسب ڈھنگ سے کھیت جوتا، بڑھیا بیج بوئے، مناسب مقدار میں گوبر کھاد اور کیمیاوی کھاد استعمال کی۔ بس یہی آپ کی کامیابی کا راز ہے۔

شری سمپت راؤ ہری! جیسے ہم جوش اور پُرجوش کسان بھارت کے لئے زیادہ اناج اگا کر صحیح معنوں میں نئے بھارت کی تعمیر میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

پلان سے مضبوطی، پلان سے خوشحالی
پلان کو کامیاب بنایئے،
محنت سے، بچت سے،